طلوعِ اسلام

جون
سنہ ۱۹۵۴ء

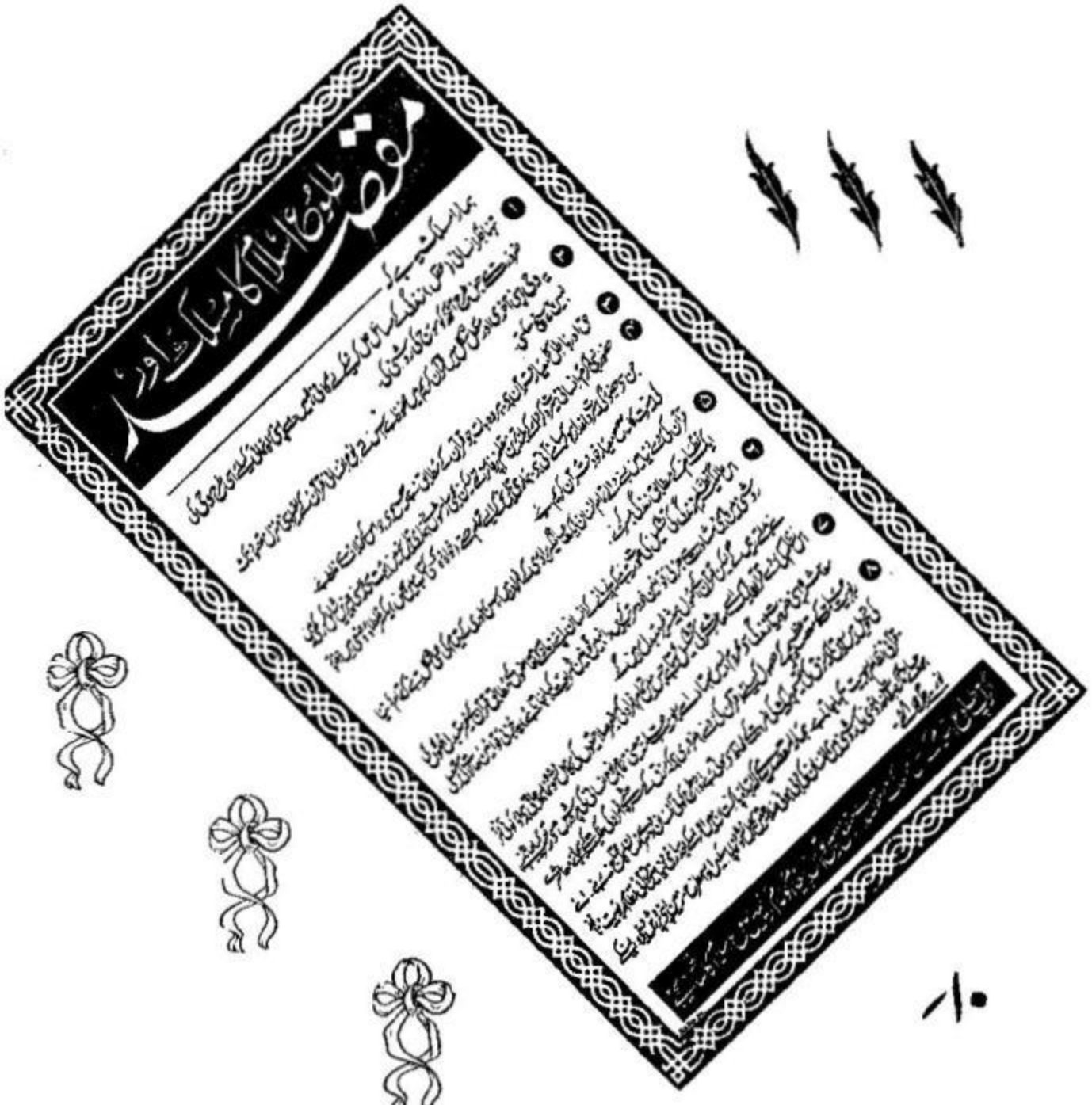

۱۰/

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدلِ اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		" غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۷	جون ۱۹۵۴ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

روزے کے احکام	۴
لمعات	۵ - ۹
آپ نے شاید اس پر غور نہیں کیا؟	۱۰
منیر کمیٹی کی رپورٹ	۱۱ - ۳۱
یتیم پوتا محجوب نہیں ہو سکتا (علامہ اسلم جیراجپوری)	۳۲ - ۳۴
دو اہم گوشے	۳۵ - ۴۴
امام مہدی کا عقیدہ اور مودودی صاحب	۴۵ - ۴۸
بھولی ہوئی کہانیاں (علامہ شبلی نعمانی)	۴۹ - ۵۲
محجوب الارث (علامہ اسلم جیراجپوری)	۵۳ - ۵۴
نقد و نظر	۵۵ - ۵۶
(۱) IQBAL MIND AND THOUGHT.	
(۲) مارکس ازم اور اسلام	
(۳) عالمی اعداد و شمار	
(۴) اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید	
وہبی کے وہی فضل الحق	۵۷ - ۶۲
رفتارِ عالم	۶۳ - ۷۳

روزے کے احکام

دوسرے ہی روزے مائی جیبو پھر روتی ہوئی آگئی۔

مائی جیبو ایک بڑھیا پنا گزین ہے۔ بڑی دکھیاری اور مصیبتوں کی ماری۔ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں، ایک لڑکا، کوئی دس بارہ برس کی عمر کا۔ یہ کنبہ کھانیوالا اور کمانیوالا کوئی نہیں۔ اس کا گذارہ محلہ کی عورتوں کی "خداترسی" پر تھا تین ماہ اُدھر کی بات ہے، ان عورتوں نے ملکر تجویز کیا کہ مائی جیبو کے لڑکے کیلئے خوانچہ لگانے کا انتظام کر دیا جائے۔ مائی نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ لڑکا خوانچہ لگانے لگ گیا۔ مائی اسے آلو چنے ابال دیتی۔ وہ دن بھر بیچتا رہتا۔ شام تک آٹے کے پیسے مل جاتے۔ مائی اس انتظام سے بہت خوش تھی۔ اس نے اس کے بعد خیرات کا ایک پیسہ بھی کسی سے قبول نہیں کیا۔

لیکن دوسرے روزے کو وہ آئی تو پھر روتی ہوئی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کل بچہ حسب معمول خوانچہ لگا کر باہر گیا تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ رمضان المبارک کے مہینے میں اس طرح کھانے پینے کی چیزیں بیچنا منع ہے۔ بات آگے بڑھی تو مسجد کے مولوی صاحب نے بھی فیصلہ ان لوگوں کے حق میں دیدیا اور لڑکے سے کہدیا کہ اگر خوانچہ لیکر باہر آؤ گے تو اسے نالی میں پھینکدیا جائیگا۔ چنانچہ اب وہ سہما ہوا گھر میں بیٹھا ہے۔ کل کچھ پکا نہیں، رات آٹا نہیں خریدا جا سکا۔ ابلے ہوئے چنے خراب ہو گئے، تو یونجی بھی ضائع ہو گئی ہے اور اب مہینہ بھر اسی طرح گذارنا پڑیگا۔ یہ کہہ کر مائی جیبو پھر رونے لگ گئی۔

یہ ماجرا صرف مائی جیبو کے لڑکے کے ساتھ ہی نہیں گذرا۔ شہر میں ہزاروں غریب ایسے ہیں جن کے کنبے کی پرورش کا دارومدار اسی قسم کی خوانچہ فروشی پر ہے۔ مہینہ بھر کیلئے ان سب کے کاروبار بند ہو گئے۔

روزہ فرمانِ خداوندی ہے۔ بجا اور درست۔ مولوی صاحبان کو حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو فرامینِ خداوندی سے آگاہ کریں اور ان کی بجاآوری کی تاکید کریں لیکن سوال یہ ہے کہ اسکے متعلق سوچنا اور کچھ کرنا بھی کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں کہ ان احکام خداوندی کی بجاآوری سے جو معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا حل ہے۔ مولوی کہدیتا ہے کہ یہ میرا کام نہیں میرا فریضہ شرعی احکام تک محدود ہے۔ اربابِ حکومت کہتے ہیں کہ یہ ان کا بھی کام نہیں۔ ان کا کام ملک کا نظم و نسق قائم رکھنا ہے۔ غریب بیچارہ خاموشی کو گھر میں بیٹھ جاتا ہے اور بھوک سے بلبلاتے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے اور "اللہ کی مرضی" کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

لیکن اسکو کون بتائے کہ جس اللہ نے روزوں کا حکم دیا تھا اسکی "مرضی" ایسی نہیں تھی۔ اس نے اگر ایک طرف کچھ فرائض عائد کئے تھے تو دوسری طرف اپنے اوپر کچھ ذمہ داریاں بھی لی تھیں۔ اس نے ایک طرف کہا تھا کہ کتب علیکم الصیام (تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں) تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ نحن نرزقکم وایاھم (تمہاری اور تمہاری اولاد کی روٹی کی ذمہ داری ہم پر ہے) اس نے کہا تھا کہ جو ہمارے احکام کو نافذ کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لے، وہ ہماری ذمہ داریاں پوری کرنے کا فریضہ بھی اپنے سر پر لے۔

مولوی کی شریعت اپنے آپ کو صرف خدا کے احکام نافذ کرنے کی ذمہ دار سمجھتی ہے۔ خدا کی ذمہ داریاں پورا کرنے سے اسے کوئی سروکار نہیں لیکن دین کا وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے پہلے ان ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیتا ہے اور اس کے بعد احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اس میں شریعت کا کام روزے رکھانا ہی نہیں بلکہ لوگوں کی روٹی کا بندوبست کرنا بھی ہے۔ اس نظام میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ رسول اللہ صلعم نے اسی قسم کا شرعی نظام قائم کیا تھا اور اسی کے دوبارہ قائم کرنے کی دعوت طلوع اسلام دیتا ہے +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کے مختلف گوشوں اور معاشرہ کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں اور بربادیاں علی التواتر ابھر کر سامنے آتی چلی جا رہی ہیں، کونسا دیدۂ اعتبار ہے جو اس پر اشک ریز اور کونسا قلب حساس ہے جو اس پر خوں فشاں نہ ہوگا۔ لیکن یہ خرابیاں اور بربادیاں غیر متوقع نہیں۔ یہ لازمی نتیجہ ہیں ہماری ان حرکات اور افعال کا جو مسلسل چھ برس سے ہم سے سرزد ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ جو حضرات طلوع اسلام کا مسلسل مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں، ان پر واضح ہوگا کہ طلوع اسلام اپنی پہلی اشاعت کے وقت سے آج تک ملک کو ان آنے والی خرابیوں سے متنبہ کرتا اور ان کے اسباب و علل کو ایک ایک کر کے واضح کرتا چلا آیا ہے۔ ارباب حل و عقد کی طرف سے جب کوئی ایسا قدم اٹھتا جس میں ان خرابیوں کے آثار پوشیدہ ہوتے تو طلوع اسلام بغیر کسی کی رعایت کے اس پر کڑی تنقید کرتا اور کھلے الفاظ میں بتاتا کہ اس سے کن تباہیوں کا احتمال ہے۔ یہ سب اسلئے کہ طلوع اسلام ہر معاملہ کو قرآن کی بخشی ہوئی بصیرت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شے کو اس کے اصلی مقام پر دکھا دیتی ہے۔ ہم عنقریب ایک ایسی کتاب قارئین کے سامنے لائیں گے جس میں طلوع اسلام کی سابقہ تحریروں سے یہ بتایا جائے گا کہ ہم نے ان خرابیوں کو کس طرح ایک ایک کر کے گنا دیا تھا جو اس وقت ملک کے لئے اس قدر پریشانیوں کا موجب بن رہی ہیں۔

دنیا میں ہر مملکت کا اولین فریضہ خود اس مملکت کا تحفظ ہوتا ہے، جس طرح کشتی چلانے والوں کا اولین فریضہ اس کشتی کی حفاظت ہوتا ہے۔ جو مملکتیں صدیوں سے قائم ہیں اور اسقدر مستحکم کامیاب، فہمند اور بڑی بڑی قوتوں کی مالک سمجھی جاتی ہیں، وہ بھی اپنی حفاظت کی فکر سے کبھی فارغ نہیں ہوتیں۔ لیکن ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے اس کی حفاظت کا سوال اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ بڑے بچے کو تو پھر بھی کچھ وقت کے لئے، خاص حالات کے ماتحت تنہا چھوڑا جا سکتا ہے، لیکن ایک نومولود کو چوبیس گھنٹے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ عربی میں اسے تعوّذ کہتے ہیں (اور قرآن نے اعوذ برب الناس کی جو تلقین کی ہے اس سے یہی مراد ہے کہ تم اپنے نظام سے اس طرح وابستہ رہو جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہتا ہے) پاکستان ایک نوزائیدہ مملکت تھی اس لئے اسے اپنی حفاظت کیلئے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں بہت سی جماعتیں ایسی تھیں جو اس تحریک کی مسلسل مخالفت کرتی رہیں لیکن ان کی مخالفتوں اور مشئوم ارادوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا۔ شکست پندار نفس انسانی میں بڑا گہرا زخم پیدا کیا کرتا ہے جس کا اندمال بہ مشکل ہو سکتا ہے۔ یہ جماعتیں اپنے سینہ کے اس ناسور کو چھپائے ہوئے پاکستان میں آئیں۔ مملکتِ پاکستان کا

فریضہ تھا کہ وہ اپنے تحفظ کی خاطر ان جماعتوں سے بہت زیادہ محتاط رہتی اور ان کی حرکات پر کڑی نگاہ رکھتی۔ پنجاب میں مجلس احرار اور جماعت اسلامی، ایسی ہی جماعتیں تھیں۔ ان کے پاکستان کے مخالف اور اینٹی گورنمنٹ ہونے کے متعلق فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ سرحد میں سرخ پوشوں کی جماعت اور ان کے لیڈر خان عبدالغفار خاں (جو سرحدی گاندھی کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے) پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی مخالفت کا تو یہ عالم تھا کہ جب کانگریس تک بھی تقسیم ہندوستان پر راضی ہو گئی تھی تو یہ اس وقت بھی اپنا سر ہلاتے رہے اور کہتے رہے کہ ہم تقسیم کو نہیں مانیں گے۔ چنانچہ انھوں نے سرحد میں ریفرینڈم کرایا اور اس میں ایسی شکست کھائی جس کی چوٹ ان کی ہڈیوں کے گودے تک کو متاثر کر گئی۔ ایک شکست خوردہ اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والا پٹھان اپنے سینہ میں جن جذبات کو پرورش دیتا ہے اس کا کسے علم نہیں۔ ان منظم جماعتوں کے علاوہ، مختلف افراد ایسے تھے جنھیں مسلم لیگ یا اس کی قیادت کے خلاف سخت شکایات تھیں۔ مثلاً بنگال کے فضل الحق صاحب اور حسین شہید سہروردی اور سندھ کے مسٹر جی۔ ایم۔ سید اور ان کے ہم نوا۔ وقس علی ہذا۔ ان کے علاوہ (خصوصیت سے بنگال میں) کمیونسٹ تھے جن کا پروگرام ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر غیر اشتراکی معاشرہ میں تخریب اور فساد پیدا کرتے رہیں تاکہ اس نظام کی مشینری اپنے اندرونی انتشار سے تہ و بالا ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں قریب ڈیڑھ کروڑ ہندو اور ان کی منظم قومی جماعت نیشنل کانگریس موجود تھی۔ ان کے نزدیک بھارت کا دو حصوں میں بٹ جانا گویا ماتا کے ٹکڑے کر دینے کے مرادف تھا۔ نیز یہاں مرزائی بھی تھے جو لاکھ بھلانے پر بھی اس حقیقت کو نہیں بھلا سکتے کہ ملک کی تقسیم کی وجہ سے وہ قادیان چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آج قادیان پر ہندو اور سکھ قابض ہیں۔ اس تصور سے ان کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگ ہو سکتا ہے کہ اگر (خدانخواستہ) کسی وقت مکہ پر اوم کا جھنڈا لہرانے لگے تو مسلمانوں کے دل کی کیا کیفیت ہو جائے!

یہ تھے وہ عناصر جو تشکیلِ پاکستان کے وقت یا اس کے فوری بعد مملکت پاکستان میں موجود تھے۔ علاوہ بریں جس افراتفری میں پاکستان وجود پذیر ہوا اور ہمیں اس کی مہلت ہی نہ ملی کہ ہم ہر چیز کو اپنے اپنے مقام پر اطمینان سے رکھ سکیں وہ بھی کچھ کم پریشان کن نہ تھی۔ ان حالات میں مملکت کا اولین فریضہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان تخریبی عناصر پر بڑی کڑی نگاہ رکھتی اور انھیں اس کی قطعاً اجازت نہ دیتی کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر سکیں جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ پاکستان کی سالمیت اور حفاظت پر کسی قسم کی زد پڑنے کا احتمال ہو سکتا ہو۔ لیکن قبل اس کے کہ اس قسم کا کوئی انتظام کیا جاتا، ان مخالفین نے نہایت سادگی اور ہشیاری سے اس خیال کو عام کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان ایک جمہوری مملکت ہے اور جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو فکر و عمل کی پوری پوری آزادی حاصل ہو نیز جمہوریت کیلئے ایک حزب مخالف بھی ناگزیر ہے۔ جن جماعتوں نے مذہب کا نقاب اوڑھ رکھا تھا انھوں نے ہر محراب و منبر سے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام آزادی کا مذہب ہے اور ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ باطل و استبداد کا پوری جانفشانی سے مقابلہ کرے۔ وہ ان کی راہ میں جو مصیبتیں اٹھائے گا انھیں جہاد فی سبیل اللہ کہا جائے گا اور اگر وہ اس کے لئے اپنی جان دیدیگا تو وہ شہید ہوگا۔ ان کے اس پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے ارباب بست و کشاد بھی جمہوریت کے اس غلط تصور اور حریت فکر و نظر کے اس گمراہ کن فلسفہ کے فریب میں آ گئے، حالانکہ انھیں سمجھنا چاہیے تھا کہ اس جمہوری آزادی کے لئے جن مملکتوں کی مثال پیش کی جاتی ہے ان کے

حالات کیا ہیں اور اسلام نے جس حریت فکر و عمل کا تصور پیش کیا ہے اس کا صحیح منشا کیا ہے؟ جمہوریت کے لئے انگلستان کی مثال پیش کی جاتی ہے لیکن وہ قوم قریباً قرن کی گردشوں سے گذرنے کے بعد اس مقام تک پہنچی ہے۔ اس قوم کے رگ و ریشہ میں اپنے قومی مفاد کا جذبہ اس حد تک سرایت کر چکا اور ان کے خون کا جزو بن چکا ہے کہ ان میں (لارڈ ہا ہا جیسی اِکا دُکا مثال کو چھوڑتے ہوئے) غدارانِ وطن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف اسلام کو لیجئے۔ وہ اپنے نظام کی تشکیل ان افراد کے ہاتھوں سے کرتا ہے جو اس کی صداقت پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتے ہیں اور اس کے استحکام میں اپنی دنیا اور عاقبت کی نجات و سعادت پاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب قرنِ اول میں اسی نظام کی تشکیل ہوئی ہے تو ان میں سے کوئی فرد ادنیٰ سے ادنیٰ غداری کا بھی مرتکب نہیں ہوا۔ لیکن جو قوم نہ ابھی اپنی ملی تربیت سے اس مقام پر پہنچی ہو اور نہ ہی وہ ایمان کی اس قوت سے فیضیاب ہو۔ دوسری طرف ان میں غداروں اور منافقوں کی اتنی کثیر تعداد موجود ہو انھیں جمہوریت اور آزادیٔ فکر و آراء کے نعروں سے متاثر ہو کر کھلے چھوڑ دینا، سانپ کے بچوں کو دودھ پر پالنے یا بچے کے ہاتھ میں چاقو دیدینے کے مرادف ہوتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے۔

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

ہم اس سے متفق ہیں کہ حکومت کے کاروبار پر تنقید ضروری ہے۔ اس سے غلطیوں کی اصلاح اور خامیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جن افراد اور جماعتوں کے متعلق یقینی طور پر علم تھا کہ وہ پاکستان کی بدترین دشمن ہیں اور ان کی آتشِ انتقام صرف اسی صورت میں فرو ہو سکتی تھی جب پاکستان (خاکم بدہن) تباہ و برباد ہو جائے انھیں مملکت کے خلاف نفرت اور عداوت کے خیالات پھیلانے کی کھلی چھٹی دیدینا اپنی تباہی آپ مول لینا تھا۔ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے ارباب حل و عقد ان کی اس فریب دہی کا شکار ہو گئے اور رواداری اور کشادہ نگہی کے غلط مفہوم سے انھیں اجازت دیدی کہ وہ اس کشتی میں جو پہلے ہی گرداب بلا میں الجھی ہوئی تھی چھید کرنے چلے جائیں۔ مجلس احرار فتنوں پر فتنے برپا کرتی چلی گئی لیکن اس سے کوئی باز پرس نہ کی گئی۔ جماعت اسلامی کامل چھ برس سے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کے شدید ترین جذبات بھڑکاتی چلی آ رہی ہے۔ منیر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ان کا منشا ہی یہ ہے کہ یہاں کی حکومت الٹ کر اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ انھوں نے ہر طرف بددلی اور افسردہ خاطری پھیلا رکھی ہے۔ وہ لوگوں کو پاکستان کے مستقبل کی طرف سے مایوس کرتے چلے جا رہے ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ حکومت نے ان پر کوئی قانونی بندش عائد نہیں کی بلکہ انھیں اس قدر اہمیت دے رکھی ہے کہ گذشتہ سال فسادات پنجاب کے دوران میں ان کے امیر کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا جاتا ہے اور وہ وہاں کھلے بندوں کہتا ہے کہ ملک میں سول وار ہو رہی ہے۔ اسوقت ان کا امیر جیل میں ہے لیکن یہ جماعت اس کی مظلومیت اور حکومت کے استبداد اور قہرمانیت کے چرچے

اس طرح سے کرتی ہے جس طرح بنو عباس کے دُعاۃ اور نقباء نے اہل بیت کی مظلومیت اور بنی امیہ کے استبداد کا شور مچا کر اپنی حکومت قائم کرنے کیلئے زمین ہموار کر لی تھی۔ سرحد میں سرحدی گاندھی اور بلوچستان میں بلوچی گاندھی (عبدالصمد خاں) کی حراست سے فتنہ دبا ہوا تھا لیکن ان کی رہائی کے بعد انھیں پھر کھلی چھٹی دیدی گئی ہے کہ وہ پختونستان کا نظریہ عام کرتے پھریں۔ چنانچہ انھوں نے ملک کی فضا کو اسقدر مسموم کر دیا ہے جس کے نتائج بڑے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ سندھ میں جی ایم سید کا گروپ ہے جو سندھیوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کا مطالبہ لئے بیٹھا ہے انھیں بھی ہر طرح سے آزادی ہے کہ جو جی میں آئے کہتے پھریں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ بنگال میں ان تخریبی عناصر کو ایسا بدلگام چھوڑا گیا کہ انھوں نے رفتہ رفتہ بنگالیوں کے دل میں یہ زہر اچھی طرح سے بھر دیا ہے کہ وہ ایک الگ قوم ہیں ان کا کلچر الگ ہے۔ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے انھیں سارے پاکستان پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن غیر بنگالی انھیں ان کے اس حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ ان کے سخت دشمن ہیں ان کے حقیقی بہی خواہ ہندو بنگالی ہیں خواہ وہ مشرقی بنگال کے ہوں یا مغربی بنگال کے۔ اس صورت حالات کے پیدا کرنے کے ممد و معاون خود ہمارے اربابِ حکومت بھی ہیں جنھوں نے بہت عرصہ پہلے ملازمتوں میں صوبائی تناسب کے حق کو تسلیم کر لیا تھا۔ سہروردی صاحب مشرقیوں میں شرقی اور غربیوں میں غربی بنکر نشست و انتشار کا بیج بکھیرتے چلے آرہے ہیں۔ کمیونسٹوں کے حوصلے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ وہ اب ملک کی صنعت کو عملاً تباہ کرنے پر اتر آئے ہیں۔ مشرقی بنگال کی زمام حکومت ان فضل الحق صاحب کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے جو کلکتہ میں پہنچکر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم بہت بڑی غلطی تھی اور بکھرے ہوئے بیراب بھی سمیٹے جا سکتے ہیں۔ (معلوم نہیں جس تاریخ تک یہ پرچہ شائع ہوگا اسوقت تک حالات کیا ہو جائیں گے لیکن آج تو یہی نظر آتا ہے کہ) مشرقی بنگال میں ایسا خوف اور ہراسانی پیدا کر دی گئی ہے جس سے ہر غیر بنگالی مسلمان وہاں سے بھاگ کر مغربی پاکستان پہنچنے کیلئے مضطرب و بیقرار نظر آرہا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ایک طرف وہاں کا خلا پر کرنے کیلئے مغربی بنگال کا ہندو آگے بڑھنا شروع کر دیگا۔ دوسری طرف مغربی پاکستان کی حالت یہ ہے کہ کھوکھراپار کے درّے نے اسکی کمر توڑ رکھی ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کو بھی پناہ گزینوں نے ادھر کا رخ کر لیا تو یہاں ایسی معاشی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی جن سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹ ادھر بھی ہڑبونگ پیدا کر دیگا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم جس میں ملک گر چکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کا علاج کیا ہے۔ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں یہ خرابیاں غیر متوقع نہیں ہیں اسلئے ان کا علاج بھی کوئی نیا نہیں ہوگا۔ ہم ان خرابیوں کے متعلق بھی شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں اور انکا علاج بھی ساتھ ساتھ بتاتے رہے ہیں۔ اسی کو ہم آج پھر دہرائے دیتے ہیں:۔

(۱) ملک میں تمام جماعتوں اور پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس کیلئے سب سے پہلے خود مسلم لیگ کو ختم کرنا ہوگا۔

(۲) پارٹیوں کو ختم کرنے کے بعد تمام افتراق پسند افراد کو غیر مبہم الفاظ میں متنبہ کر دیا جائے کہ اگر ان کی طرف سے کوئی حرکت بھی ایسی سرزد ہوئی جس سے پاکستان کی سالمیت پر زد پڑنے کا اندیشہ ہوا تو انھیں عبرتناک سزا دی جائے گی۔ اس کے بعد جس کسی طرف سے اس قسم کی حرکت سرزد ہو اسے واقعی ایسی سزا دی جائے جو دوسروں کیلئے عبرت انگیز ہو۔

(۳) مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر ملک کو ایک وحدت بنا دیا جائے اور اگر انتظامی ضروریات کیلئے ملک میں مختلف خطے بنانے کی ضرورت ہو تو انھیں موجودہ صوبوں کے خطوط پر ہرگز نہ بنایا جائے۔

(۴) مشرقی پاکستان میں صوبائی حکومت کو ختم کر کے نظم و نسق مرکز کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور وہاں غیر جانبدارانہ استصواب کے ذریعہ دریافت

کیا جائے کہ وہ لوگ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ بھائیوں کی طرح ساتھ رہنے پر آمادہ ہوں اور فیڈریشن کے انداز کی حکومت چاہتے ہوں تو انھیں واضح الفاظ میں بتادیا جائے کہ اس فیڈریشن میں ہر یونٹ کا درجہ مساوی ہوگا خواہ اسکی آبادی کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ اس شرط کے ساتھ فیڈریشن کیلئے آمادہ نہ ہوں تو پھر کانفیڈریشن کے انداز کی حکومت قائم کردی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ مشرقی بنگال کے عوام کبھی علیحدگی کے حق میں نہیں ہوں گے۔ یہ زوان لوگوں کی چلائی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو اپنی کاملاً خود مختار حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ وہاں کے باشندے کامل خود مختار حکومت چاہتے ہیں تو پھر ہمیں باصد دل ناخواستہ اس علیحدگی کو بھی گوارا کرلینا چاہئے اسلئے کہ کسی کو باندھ کر ساتھ رکھنے کی بجائے رضامندانہ طور پر الگ ہوجانا کم خطرات کا موجب ہوتا ہے۔

(۵) ملک کے موجودہ ہنگامی حالات کے پیش نظر گورنر جنرل کو چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ گذشتہ انتخابات نے بتادیا ہے (خواہ وہ مسلم لیگ کی کامیابی پر منتج ہوئے ہوں اور خواہ اسکی شکست پر) کہ ملک میں سیاسی شعور بالکل بیدار نہیں ہوا۔ مفاد پرست گروہ، خواہ وہ کھلے بندوں سیاست کے نام پر میدان میں آئیں اور خواہ مذہب کا نقاب اوڑھ کر، عوام کے جذبات کو ابھار کر اپنے پیچھے لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا ان انتخابات کی رو سے منتخب شدہ ارکان نہ قوم کے صحیح ترجمان قرار پا سکتے ہیں اور نہ ملی مفاد کے محافظ۔ جب تک قوم میں تعلیم و تربیت عام نہ ہوجائے اور ان کے سیاسی شعور میں خاصی بیداری پیدا نہ ہوجائے اسوقت تک مغربی طرز کی جمہوریت کبھی مفید نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ ان حالات میں بہتر شکل یہ ہوگی کہ گورنر جنرل اپنے مشورہ کے لئے ان حضرات پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ مرتب کرلیں جن کی بصیرت اور دیانت پر انھیں پورا پورا اعتماد ہو۔ وہ اسی مجلس کے مشورہ سے ملک کا انتظام چلائیں اور اس میں اتنا دیکھ لیں کہ ان کا کوئی قدم قرآن کی کھینچی ہوئی حدود سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

ہم پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب سے پرزور درخواست کرینگے کہ وہ اس نازک وقت میں اس جرأت و ہمت سے کام لیں جس سے انھیں فطرت نے فیضیاب کر رکھا ہے۔ اگر وہ اس وقت ہمت کرکے آگے بڑھ آئے تو جس طرح ناظم الدین وزارت کی برطرفی میں قوم نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا تھا اسی طرح ان کے اس اقدام میں بھی ملت ان کے ساتھ ہوگی۔ اسوقت پاکستان عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ اگر انھوں نے اس کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑ دیا تو جس طرح تاریخ نے اقبالؒ اور جناحؒ کی یاد کو پاکستان کے تصور دینے والے اور اسے حاصل کرنے والے کی حیثیت سے محفوظ کرلیا ہے، وہ اسی طرح غلام محمد کو پاکستان کے بچانے والے کی حیثیت سے حیاتِ جاوید عطا کردے گی اور وہ اپنے خدا کے سامنے بڑے سرخرو جائیں گے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری یہ فقیرانہ صدا محترم گورنر جنرل کے کانوں تک پہنچ سکے گی یا نہیں۔ اس کیلئے ہم قارئین طلوع اسلام سے گذارش کریں گے کہ اگر وہ اس علاج سے متفق ہوں جسے ہم نے تجویز کیا ہے تو وہ محترم گورنر جنرل سے (بذریعہ تار یا خط) درخواست کریں کہ وہ طلوع اسلام کے پیش کردہ مشورہ پر غور کریں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم سب اس کوشش سے یہ خطۂ زمین جس میں ہم اپنی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت اور ناموس کو سنبھالے بیٹھے ہیں تخریبی عناصر کی مزید ضرر رسانیوں سے محفوظ ہوجائیگا۔ اور جب ان کی طرف سے اطمینان ہوجائے گا تو پھر ہم ان تصورات کو عملاً شکل کرنے کے بھی قابل ہوجائیں گے جن کیلئے ہم نے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا تھا۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

آپ نے شاید اس پر غور نہیں کیا؟

آج نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام عالم اسلامی میں ادارہ طلوع اسلام وہ واحد ادارہ ہے جو قرآنی فکر کو عام کرنے اور اس فکر کے مطابق معاشرہ کو تشکیل کرنے کیلئے سوچ رہا اور کام کر رہا ہے۔ غیر مسلم تو ایک طرف خود مسلمانوں کی طرف سے بھی قرآنی فکر کی مخالفت ہو رہی ہے کیونکہ اندھیرے میں بسنے والوں کیلئے روشنی کا وجود بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں جو دل سے چاہتے ہیں کہ دنیا میں پھر سے قرآنی معاشرہ قائم ہو جائے اس مقصد کیلئے ہم نے ایک اسکیم پیش کی تھی کہ ایک سو روپیہ کی رقم ہمیں پیشگی دیدی جائے ہم اس کے معاوضہ میں آہستہ آہستہ طلوع اسلام کی کتابیں ان حضرات کو دیتے جائیں گے تا آنکہ ان کی سو روپیہ کی رقم پوری ہو جائے۔ اگر کسی طرح اس اسکیم کو بند کرنا پڑا تو ان کی بقایا رقم ان کو واپس دیدی جائے گی۔ یہ ایک خالص کاروباری اسکیم تھی جس میں ہم نے عطیہ کچھ نہیں مانگا تھا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ طلوع اسلام کے ہزارہا قارئین میں سے اس وقت تک صرف دو سو چوبیس (۲۲۴) حضرات نے شمولیت اختیار کی ہے۔ ان میں سے دو سو سولہ (۲۱۶) ناموں کا اعلان اس سے پہلے ہو چکا ہے بقایا آٹھ حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

کراچی	۲۱۷	فضل محمد صاحب۔ پاک مل کراچی کمپنی۔ ۵۸/۵۹ پی ایم اے بلڈنگ
گوجرانوالہ	۲۱۸	شیخ سراج الدین صاحب۔ نیو کلاتھ مارکٹ
نوشہرہ	۲۱۹	محمد اسلم خان صاحب۔ بدرشی
گیا	۲۲۰	اردو نیشنل لائبریری۔ علی نگر پالی۔
جھنگ	۲۲۱	رائے محمد خاں خالد صاحب۔ ترجمان بزم طلوع اسلام کلری
کراچی	۲۲۲	مظفر الدین احمد صدیقی صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ وزارت امور خارجہ حکومت پاکستان
رنگون	۲۲۳	ڈی جی مانیتھ صاحب۔ ۴۸/۲۶ ویں سٹریٹ۔ پوسٹ بکس ۹۱۴
	۲۲۴	صحیح نام فی الحال معلوم نہیں۔

جناب پرویز کے ترجمۂ قرآن اور قرآنی لغت کے علاوہ جنکی تالیف میں وہ اسوقت شب و روز منہمک ہیں ہمارے سامنے بہت سی کتابیں اشاعت کیلئے تیار رکھی ہیں۔ مثلاً معارف القرآن کی پہلی تینوں جلدیں (جو اب نایاب ہیں اور جنہیں مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کئے جانے کا انتظام درپیش ہے) — نظام ربوبیت (جو دورِ حاضرہ کی ایک نادر تصنیف ہے) فردوس گم گشتہ (مجموعۂ مضامین جناب پرویز) پاکستان کی چھ سالہ زندگی پر محاکمہ۔ جماعتِ اسلامی سے متعلق ایک ناقدانہ تالیف۔ فکرِ اقبال کے متعلق جناب پرویز کا مطالعہ۔ اعمال نامے۔ قوم اور قائدین پاکستان کے اعمال کا حقیقت کشا اور عبرت آمیز تفصیلی تذکرہ۔ نیز معارف القرآن کی پانچویں جلد دو ضخیم حصوں میں۔ یہ اور اس قسم کی اور کتابیں اشاعت کا انتظار کر رہی ہیں۔ ان کی اشاعت آپ کی معاونت کے بغیر ناممکن ہے — آپ سوچئے کہ اس باب میں آپ کا فریضہ کیا ہے؟

منیر کمیٹی کی رپورٹ

وہ جو کہتے ہیں کہ

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اس کی صداقت اس قیامت خیز سانحہ سے ہوتی ہے جس کی ابتدا گذشتہ سال پنجاب کی آگ اور خون کی ہولی سے ہوئی اور جس کی انتہا، وہ رپورٹ ہے جو ان فسادات کی اس تحقیقاتی کمیٹی نے مرتب کی ہے جو جسٹس محمد منیر کی صدارت میں مقرر ہوئی تھی اور جس کی ڈرافٹ کاپی (بزبان انگریزی) حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی تو مسلمانوں کی کئی جماعتیں ایسی تھیں جو اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ پنجاب میں متفرق قومیت پرست، مولویوں کے علاوہ مجلس احرار اور جماعت اسلامی اس مذموم کوشش میں پیش پیش تھیں۔ ان کی کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا لیکن ان لوگوں کا بغض و عناد کم نہ ہوا اور انھوں نے مسلسل اپنی کوششیں جاری رکھیں کہ کسی نہ کسی طرح اس مملکت میں ضعف آجائے اور پاکستان (خاکم بدہن) تباہ ہو جائے۔ ان کی یہ کوششیں مختلف پہلو بدلتی رہیں تا آنکہ پچھلے سال انھوں نے منظم طور پر ایک جست لگائی اور مسئلہ ختم نبوت کی آڑ میں ملک کو آگ اور خون کے طوفان میں دھکیل دیا۔ وہ تو یوں کہئے کہ مسلمانانِ پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ یہ آگ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی ورنہ انھوں نے اپنی طرف سے اس کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان کی تخریبی کوششیں عوام کی جذبات پرستی، ارباب حل و عقد میں سے بعض کی غدارانہ خود غرضیاں اور بعض کی نالائقیاں، مل ملا کر اس تباہی کا موجب بنیں۔ جب یہ فتنہ فرو ہوا تو جسٹس منیر کی زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمیٹی متعین کی گئی کہ وہ متعین کرے کہ ان فسادات کی ذمہ داری کس کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ کمیٹی تیشۂ فرہاد لیکر اٹھی اور نو دس ماہ کی مشقت انگیز کاوش کے بعد جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس تحقیقات کے ضمن میں انھوں نے اپنے آپ کو صرف فسادات اور انتظامات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسانی

مباحث کی اہمیت

زندگی اور اس کے معاشرہ سے متعلق بنیادی اور اہم مسائل کو بھی بحث کا مرکز بنا لیا اور اپنے اس صحیفہ میں مذہب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات، الٰہیات، عقل، وحی، مکان و زمان، انسان کا مبدأ و معاد، مقصدِ حیات، مملکت و کلیسا کے فرائض، اقتدار اعلیٰ، جمہوریت اور پیشوائیت وغیرہ جیسے اہم مباحث کو بھی سمیٹ لیا۔ یہ ضروری نہیں کہ ان مباحث سے متعلق جو کچھ اس رپورٹ میں لکھا گیا ہے اس سے ہر شخص متفق ہو لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس رپورٹ میں جن بنیادی سوالات کو اٹھایا گیا ہے اور جس انداز سے ان کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، اگر عالمِ اسلام کے مفکرین ان سوالات پر اس انداز سے غور و فکر کر کے ان کا کوئی متفقہ حل تجویز کر لیں تو وہ نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے مستقبل کی فلاح و فوز

ضامن بن سکتا ہے۔ ہم محترم جسٹس محمد منیر اور ان کے رفیق کار جسٹس کیانی کو ملت پاکستانیہ کی طرف سے مستحق تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں۔

ہمارا مقصود

اس وقت ہمیں اس رپورٹ اور اس کے نتائج پر تبصرہ مقصود نہیں۔ ہم سردست صرف ان مباحث کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جن کا تعلق اسلامی مملکت سے ہے اور جسے اس رپورٹ کے باب چہارم میں خصوصیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان مباحث سے ہماری دلچسپی کی وجوہات بالکل ظاہر ہیں۔ طلوع اسلام کے پیش نظر پہلے دن سے ایک قرآنی مملکت کا قیام ہے۔ اس نے تحریک پاکستان کی حمایت میں اپنا لہو پانی ایک کر دیا تو محض اسلئے کہ اس تحریک سے مقصود ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول تھا جس میں قرآنی نقشہ کے مطابق مملکت قائم ہو سکے۔ اور حصول پاکستان کے بعد اس نے پاکستان کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنے امکان بھر جدوجہد کی (اور کر رہا ہے اور کرتا رہے گا) تو محض اس لئے کہ یہ اس خطۂ زمین میں اس انداز کی مملکت کے امکانات دیکھتا ہے جس کا نقشہ خود خدا نے قرآن میں مرتب کیا اور جسے محمد الرسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس کی آرزوؤں کا منتہا، اس کی تمناؤں کا محور، اس کی تگ و تاز کا مرکز، اس کی دعائے سحری کا مقصود، اس کے نالۂ نیم شبی کا مطلوب اسی نہج کے نظامِ ربوبیت کا قیام ہے جسے آسمان کی آنکھوں نے ایک بار دیکھا اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آجتک سرگرداں ہے۔ جس طرح ہمارے مذہب کے اجارہ دار پہلے حصولِ پاکستان کے بدترین مخالف تھے اسی طرح یہ لوگ اب قرآنی مملکت کے قیام کے بھی سنگین ترین دشمن ہیں، اس لئے کہ اس کے قیام میں ان کی وہ جھوٹی پیشوائیت چھن جاتی ہے جس پر ان کی زیست کا دارومدار ہے۔ لیکن جس طرح ان کی مذموم کوششوں کے علی الرغم خطۂ پاکستان حاصل ہو کر رہا اسی طرح ہمیں توفیق ایزدی کے بھروسہ پر یقین کامل ہے کہ

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے ❊ یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اس رپورٹ میں سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ

اسلامی مملکت

اسلامی مملکت، جس کے متعلق باتیں ہر شخص کرتا ہے لیکن جس کی بابت سوچا کوئی بھی نہیں

کہتے کسے ہیں؟ (ص ۲۰۳)

اس کے بعد انھوں نے مملکت کے عمومی تصور سے بحث کی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ ان علماء کے تصور کے مطابق جنھوں نے ان کے سامنے اظہار خیالات کیا ہے، اسلامی مملکت کس قسم کی ہوتی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر پاکستان میں اس قسم کی مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہم پہلے، مختصر الفاظ میں، ان سوالات کے متعلق اس رپورٹ کے مندرجات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ عرض کریں گے کہ مولوی صاحبان کا پیش کردہ تصور کس قدر قرآن کے خلاف ہے اور ایک صحیح قرآنی مملکت کس طرح ان تمام خرابیوں سے پاک ہو گی جن کے خدشات اس رپورٹ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مولوی صاحبان کے تصور کے

مطابق کوئی مملکت قائم ہوجائے تو اس کا نقشہ اس سے بھی بھیانک ہوگا جو اس رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہ مملکت پیشوائیت اور ملوکیت کے امتزاج کی عجمی مملکت ہوگی، قرآنی نہیں ہوگی۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور مومن یا مسلمان کسے کہتے ہیں؟ (ص۲۰۵)

اس کے بعد لکھا ہے کہ ہم نے اس سوال کو علماء کے سامنے پیش کیا لیکن

ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے لئے یہ امر موجب ہزار تاسف تھا کہ وہ علماء جن کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان بنیادی سوالات کو طے کرلیں وہ ان کے جوابات میں بری طرح سے ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ (ص۲۰۵)

بہرحال مولوی صاحبان کے پیش کردہ خیالات کے مطابق اسلام کے بنیادی اصولوں کے متعلق جو کچھ رپورٹ میں کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ اسلام کی رو سے انسانی زندگی کی راہنمائی خدا کی وحی کی رو سے ہوتی ہے، عقل انسانی کی رو سے نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی اپنے آخری رسولؐ کی وساطت سے قرآن کریم میں محفوظ کردی۔ لہٰذا ایک مسلمان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآن کو سمجھے، اس کی تعلیم پر یقین رکھے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

جن رسولوں پر یہ وحی آتی تھی ان کا ہر قول و فعل منشائے خداوندی کے مطابق ہوتا تھا اس لئے ان کے اقوال و افعال بھی اسی طرح منزہ عن الخطا ہیں جس طرح وحی خداوندی۔ نبی اکرم صلعم کے یہ اقوال و افعال سنت کہلاتے ہیں جو قرآن کی طرح ہر قسم کے سہو خطا سے مبرا ہیں۔ یہ سنت حدیث کی کتابوں میں درج ہے۔

حدیث کی حیثیت حدیث کے متعلق رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ

دور حاضرہ کے قانون شہادت کے مطابق، جس میں خود ہمارا قانون بھی شامل ہے، احادیث کو سنت نبویؐ کے لئے بطور شہادت تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے کہ ان میں سے ہر حدیث اس طرح سے آئی ہے کہ فلاں نے فلاں سے سنا اور اس نے فلاں سے لیکن قانون میں انھیں (PRO PRIOVIGORO) بطور سند لیا جاسکتا ہے۔ . . . . . ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر وہ حکم جو قرآن اور سنت سے مستنبط کیا جائے اس کا اتباع ہر مسلمان پر ضروری ہے لیکن چونکہ سنت کی شہادت صرف حدیث ہے اسلئے حدیث اور سنت کو مرادف المعنی سمجھ لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں قرآن اور سنت کہنا مقصود ہوتا ہے وہاں قرآن و حدیث کہدیا جاتا ہے۔ (ص۲۰۶-۲۰۷)

اجماع اس کے بعد لکھا ہے کہ کتاب و سنت کے بعد اجماع کا درجہ ہے۔ اجماع سے مراد ہے مجتہدین ملت کا باہمی اتفاق۔ مجتہدین سے مقصود وہ لوگ ہیں جو نبی اکرم صلعم کی وفات کے بعد اپنے علم کی بنا پر ذاتی اجتہاد کے اہل سمجھے جاتے ہیں۔ اس اجماع کو بھی منزہ عن الخطا سمجھا جاتا ہے۔ اجماع کے متعلق اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے مراد صرف مجتہدین کا باہمی اتفاق ہے نہ کہ تمام ملت کا باہمی اتفاق۔

ان مبادیات کی روشنی میں رپورٹ میں لکھا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے آئین میں حسب ذیل بنیادی اصول ہونے چاہئیں۔

(۱) قرآن اور سنت کے تمام قوانین اس مملکت کے قوانین ہوں گے جن کا نفاذ مسلمانوں پر ہوگا۔

(۲) جب تک یہ آئین علماء اور مجتہدین کے اتفاق رائے سے مرتب نہیں ہوگا، اس آئین کی ہر وہ شق جو قرآن و سنت کے خلاف ہوگی، منسوخ سمجھی جائے گی۔

(۳) مملکت کے موجودہ قوانین میں سے جو قوانین قرآن و سنت کے خلاف ہوں گے، وہ بھی منسوخ سمجھے جائیں گے تا آنکہ انھیں علماء اور مجتہدین قابل نفاذ نہ سمجھیں۔

(۴) مستقبل میں بھی ہر وہ قانون جو کتاب و سنت کے خلاف ہوگا قابل تنسیخ ہوگا۔

(۵) کوئی بین الاقوامی قانون یا کسی معاہدہ کی کوئی شق جو قرآن اور سنت کے خلاف ہوگی پاکستان کے کسی مسلمان کے لئے واجب اطاعت نہیں ہوگی۔

اس کا نتیجہ؟ علماء کے پیش کردہ نظریات کی رو سے ان مبادیات کو متعین کرنے کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس صورت حالات کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت کو قانون سازی کی اجازت ہی نہیں ہوگی اس لئے کہ شریعت تمام کی تمام مکمل ہے اور اس میں انسانی زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق قوانین پہلے سے موجود ہیں۔ لہٰذا ایسی مملکت میں جو کچھ کرنا ہوگا وہ صرف یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے علماء سے پوچھ لیا جائے کہ کتاب و سنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے اور اگر واضح حکم موجود نہ ہو تو اس کی بابت ان کا اجتہاد کیا کہتا ہے۔ جو کچھ وہ کہیں اسے ملک کا قانون تسلیم کر لیا جائے اس کیلئے نہ کسی الیکشن کی ضرورت ہے نہ مجلس آئین ساز کی۔ نہ ملت کی رائے کی ضرورت ہے نہ ان کے نمائندوں کی۔ لہٰذا ایسی مملکت میں جمہوریت کا تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسی بنا پر رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہمیں حیرت ہے قرارداد مقاصد کے مرتب کرنے والوں پر کہ ایک طرف وہ یہ لکھتے ہیں کہ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری مملکت جمہوری ہوگی۔ انھوں نے یا تو کتاب و سنت کے مفہوم کو نہیں سمجھا یا جمہوریت کے مفہوم کو۔

یہ ہے اس مملکت کے بنیادی اصول کے متعلق رپورٹ کا خلاصہ جو علماء حضرات کے تصور کی رو سے اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ (اس کے متعلق ہمارا تبصرہ بعد میں آئے گا۔)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مولوی صاحبان کے تصور کے مطابق اسلامی مملکت میں قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی اس لئے اس میں نہ کوئی مجلس مقننہ ہوگی اور نہ ہی قوم کی کوئی نمائندہ جماعت۔ بس ایک علماء کی جماعت ہوگی جس کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ بتاتی رہے کہ فلاں معاملہ میں قرآن اور حدیث میں کیا لکھا ہے۔ مولانا ابوالحسنات صدر جمعیۃ علمائے پاکستان کے الفاظ میں:

ہمارا قانون بالکل مکمل ہے اور اس میں ضرورت صرف اتنی رہتی ہے کہ اس کے ماہر یہ بتا دیں کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا منشا کیا ہے

میرے عقیدہ کے مطابق کوئی ایسا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا جس کے متعلق قرآن یا حدیث میں پہلے ہی سے قانون موجود نہ ہو۔

غیر مسلموں کی حیثیت

رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی، تو اس کے جواب میں بتایا یہ گیا کہ پاکستان میں انھیں نہ تو حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے اور نہ ہی ان کی حیثیت ذمیوں اور معاہدین کی ہوگی۔ اسی سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ مسلمان کہتے کسے ہیں؟ اس لئے کہ جس مملکت میں مسلم اور غیر مسلم میں اسقدر بنیادی فرق ہوگا یہ ضروری ہے کہ اس کی وضاحت موجود ہو کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے مختلف علماء سے جو ان کے سامنے آئے یہ سوال پوچھا کہ اسلام کی رو سے مسلمان کہتے کسے ہیں۔ اس کے جواب میں علماء کی طرف سے جو کچھ بیان ہوا، رپورٹ کے الفاظ میں وہ بڑا ہی غیر تسلی بخش تھا۔ ایسا غیر تسلی بخش کہ رپورٹ میں یہ کہنا پڑا کہ

> اگر علماء کے ذہن میں اسقدر سیدھے سے سوال کے متعلق بھی ایسا انتشار ہے تو زیادہ پیچیدہ مسائل کے متعلق ان میں جو اختلافات ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (ص ۲۱۵)

مسلمان کسے کہتے ہیں؟

رپورٹ میں علماء کے جوابات من وعن لکھ دیئے گئے ہیں جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ علمائے پاکستان

وہ توحید کا قائل ہو۔ رسولؐ اللہ کو ایک سچا رسول مانتا ہو اور جو رسول آپ سے پہلے ہو گذرے ہیں ان پر بھی ایمان رکھتا ہو۔ رسولؐ اللہ کو آخری نبی مانتا ہو۔ قرآن کو وحی منزل من اللہ مانے، رسول اللہؐ کے تمام احکامات کی اطاعت کو فرض سمجھے۔ قیامت میں ایمان رکھے۔

سوال:۔۔۔ کیا تارکِ صلوٰۃ مسلمان ہو سکتا ہے؟

جواب:۔۔۔ ہاں، لیکن منکرِ صلوٰۃ نہیں ہو سکتا۔

(۲) مولانا احمد علی صاحب صدر جمعیۃ علمائے اسلام مغربی پاکستان

جو شخص قرآن اور حدیث کو مانے وہ مسلمان ہے۔ اس سے زیادہ کچھ ماننے یا کرنے کا اس سے تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

جو شخص توحید، تمام انبیاء، تمام آسمانی کتابوں، ملائکہ اور آخرت پر ایمان رکھے وہ مسلمان ہے۔

سوال:۔۔۔ کیا ان باتوں کا زبانی اقرار ایک شخص کے مسلمان ہونے اور اسلامی مملکت میں اس کے مسلمان سمجھے جانے کیلئے کافی ہے؟

جواب:۔۔۔ ہاں۔

سوال:۔۔۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے اس کے اس ایمان کا ثبوت طلب کرے۔

جواب :— وہ پانچ شرائط جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے بنیادی ہیں اور ان میں سے کسی ایک میں بھی تبدیلی اس شخص کو خارج از اسلام کر دیتی ہے۔

(۳) غازی سراج الدین منیر صاحب

مسلمان وہ ہے جو کلمۂ طیبہ کا اقرار کرے اور اتباع رسالت میں زندگی بسر کرے۔

(۴) مفتی محمد ادریس احمد صاحب جامعۂ اشرفیہ، لاہور

مسلمان فارسی زبان کا لفظ ہے جس کیلئے عربی لفظ مسلم ہے۔ مسلمان اور مومن میں فرق ہے۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں مومن کی کوئی مکمل تعریف بیان کر سکوں۔ اس کیلئے صفحات در صفحات درکار ہیں۔ مسلم وہ ہے جو خدا کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے، خدا کی توحید، انبیاء کی رسالت اور روز جزاء پر ایمان رکھنا چاہئے۔ جو شخص اذان یا قربانی میں عقیدہ نہ رکھے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں ہیں جو رسول اللہؐ سے ہم تک تواتر کے ذریعہ پہنچی ہیں۔ مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں پر بھی ایمان رکھا جائے۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان امور کی مکمل فہرست پیش کر سکوں۔

(۵) حافظ کفایت حسین صاحب ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ

مسلمان ہونے کیلئے توحید، نبوت اور قیامت پر ایمان ضروری ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں جن کے متعلق شیعہ اور سنی میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جنھیں ضروریات دین کہا جاتا ہے، ایک مسلمان کیلئے ان پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کی فہرست مرتب کرنے میں مجھے دو دن لگ جائیں گے۔ مثال کے طور پر قرآن کی تعظیم، وجوب نماز، وجوب روزہ، وجوب حج مع شرائط اور دوسری ان گنت چیزیں ضروریاتِ دین میں شامل ہیں۔

(۶) مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی صدر جمعیۃ علمائے پاکستان

جو شخص ضروریات دین میں ایمان رکھتا ہے وہ مومن ہے اور ہر مومن مسلمان کہلا سکتا ہے۔

سوال : یہ ضروریاتِ دین کیا ہیں؟

جواب :— جو شخص پانچ بنائے اسلام اور رسالت نبی اکرمؐ پر ایمان رکھتا ہے وہ ضروریاتِ دین کو پورا کر دیتا ہے۔

سوال :— کیا ان پانچ ارکان کے علاوہ انسان کے کسی عمل کا مسلمان ہونے یا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے سے کوئی تعلق ہے؟

جواب :— یقیناً

سوال :— تو پھر اگر ایک شخص ارکان خمسہ اور رسالتِ محمدیہ پر ایمان رکھتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی چیزیں چرا لیتا ہے، امانت میں خیانت کرتا ہے، ہمسایہ کی بیوی کو نظر بد سے دیکھتا ہے اور بڑا احسان فراموش ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کو مسلمان کہیں گے؟

جواب :— اگر یہ شخص ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے جن کا میں نے ذکر کیا ہے تو اسے مسلمان ہی کہا جائے گا۔

(۷) مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی دارالشہابیہ سیالکوٹ

جو شخص رسول اللہ کے احکام کی اطاعت میں تمام ضروریات دین پر عمل کرتا ہے وہ مسلمان ہے۔

سوال :۔ ضروریاتِ دین کسے کہتے ہیں؟

جواب :۔ ضروریات دین وہ ضروریات ہیں جن کا علم ہر مسلمان کو ہے خواہ اسکی مذہبی معلومات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

سوال :۔ کیا آپ ضروریاتِ دین کو گنا سکتے ہیں۔

جواب :۔ میں نہیں گنا سکتا۔ یہ بے شمار ہیں۔ مثلاً صوم وصلوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔

(۸) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب (جماعت اسلامی والے)

مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ سیاسی اور حقیقی۔ سیاسی مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی توحید اور ختم نبوت کا قائل ہو۔ ختم نبوت کے معنی ہیں اس شخص کی زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق رسول اللہ کا آخری سند ہونا۔ نیز وہ اس پر ایمان رکھے کہ خیر و شر سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ روز جزا پر ایمان رکھے اور قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ خدا کی آخری وحی ہے۔ مکہ کا حج کرے، زکوٰۃ دے، روزہ رکھے، مسلمانوں کی طرح نماز پڑھے اور اسلامی معاشرہ کے آئین وضوابط کی پابندی کرے۔

اگر کوئی شخص ان شرائط پر پورا اترتا ہے تو وہ ایک اسلامی مملکت میں حقوق شہریت کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک شرط کو بھی پورا نہیں کرتا تو وہ شخص سیاسی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اصلاحی صاحب نے پھر یہ کہا کہ جو شخص ان چیزوں پر صرف زبانی ایمان رکھتا ہے تو وہ مسلمان کہلائے گا بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ ان پر عمل پیرا ہے یا نہیں۔

حقیقی مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ایک شخص خدا اور اس کے رسول کے تمام احکام پر ایمان رکھے اور ان پر عمل بھی کرے۔

سوال :۔ کیا آپ کے نزدیک ایک حقیقی مسلمان ہی مرد صالح کہلا سکتا ہے؟

جواب :۔ جی ہاں!

سوال :۔ جو کچھ آپ نے کہا ہے ہم اس کا مطلب یہ سمجھے ہیں کہ ایک سیاسی مسلمان کیلئے ان امور پر فقط ایمان کافی ہے اور ایک حقیقی مسلمان کے لئے ایمان کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے۔

جواب :۔ نہیں، آپ میرا مطلب ٹھیک نہیں سمجھے۔ سیاسی مسلمان کیلئے بھی عمل ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص عمل نہیں بھی کرتا تو بھی وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔

سوال :۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہیں رکھتا جن کا آپ نے ذکر کیا ہے تو کیا آپ اسے بے دین کہیں گے؟

جواب :۔ نہیں۔ میں اسے صرف بے عمل کہوں گا۔

[نوٹ :۔ اگرچہ اس رپورٹ میں یہ درج نہیں لیکن اخبارات میں یہ آیا تھا کہ اصلاحی صاحب نے کمیٹی سے کہا تھا کہ آپ کو

علماء سے ایسا سوال دفعتہً نہیں پوچھ لینا چاہیئے تھا، اس کیلئے وقت دینا چاہیئے تھا۔ طلوع اسلام۔]

(۹) صدر صاحب انجمن احمدیہ۔ ربوہ

مسلمان وہ ہے جو نبی اکرم صلعم کی امت میں داخل ہے اور کلمۂ طیبہ پر ایمان رکھتا ہے۔

ان جوابات کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے۔

یہ جوابات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان فاضل علماء میں سے کوئی دو بھی اس اصولی مسئلہ کے جواب میں متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے مسلمان کی کوئی تعریف پیش کریں اور وہ تعریف ان علماء کے فرمودات سے مختلف ہو تو ہم فوراً دائرۂ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ہم ان علماء کی بیان کردہ تعریف میں سے کسی ایک کو صحیح تسلیم کر لیں تو ہم صرف اس عالم کے نزدیک مسلمان ٹھہریں گے، باقی تمام کے نزدیک کافر قرار پائیں گے۔

مرتد کی سزا مسلمان کی تعریف کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ جو مسلمان خارج از اسلام قرار دیا جائے اسکی سزا کیا ہے؟۔ اس معاملہ میں تمام علماء متفق اللسان ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس فیصلہ کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر (مثلاً) کوئی دیوبندی رئیس مملکت ہو تو وہ تمام وہابیوں کو قتل کر دے گا اور اگر کوئی وہابی برسر اقتدار آجائے گا تو وہ دیوبندیوں کو تہ تیغ کر دے گا۔ اسی طرح سنیوں کے اقتدار میں شیعہ قتل کر دیئے جائیں گے اور اگر زمام حکومت شیعوں کے ہاتھ میں ہوگی تو سنی تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ اہل قرآن جو حدیث کو غیر یقینی مانتے ہیں ان سب کے نزدیک کافر ہیں اور اسی طرح تمام آزاد خیال مسلمان بھی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ، سنی، دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی، کوئی بھی مسلمان نہیں جس جماعت کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا اس کے نزدیک باقی سب واجب القتل ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی ذرا ذہن میں رکھئے کہ اس سوال کے جواب میں کوئی دو عالم بھی متفق نہیں نکلے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ نیز ان علماء نے مسلمان ہونے کی جو شرائط بیان کی ہیں انھیں اگر بہیئت مجموعی دیکھا جائے تو ہر شخص کے ارتداد کے لئے بے شمار وجوہات موجود ہوں گی۔ (صفحہ ۳۱۹)

اس کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہ سب کچھ اس قرآن کی موجودگی میں کہا جا رہا ہے جو حریت فکر کا سب سے بڑا علم بردار ہے اور آزادیٔ رائے کا سب سے بڑا نقیب۔

غیر مسلموں کی مذہبی تبلیغ! ارتداد کے ضمن ہی میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت ہوگی؟ اس کا جواب یہی تھا کہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب کی علانیہ تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس کے بعد رپورٹ میں جہاد کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے" جس کے ضمن میں ناسخ اور منسوخ کا سوال سامنے آگیا ہے۔ قرآنی آیات کو منسوخ ماننے میں خدا اور قرآن کے متعلق جس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے اسے مختصر الفاظ میں بیان کرنے کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ ایسے مسئلہ کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ جہانتک جہاد کا تعلق ہے، رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان علماء کے نزدیک (جن میں ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم بھی شامل ہیں) اسلام کو شمشیر اور فتوحات کے ذریعہ پھیلایا جائے گا۔ اس کے متعلق رپورٹ میں لکھا ہے کہ ایسے قانون کا جو ردعمل بین الاقوامی آئین اور اداروں کی طرف سے ہوسکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

جنگ کے قیدی

جہاد کی بات چھڑی تو جنگ کے قیدیوں کا سوال سامنے آگیا اس سوال کے متعلق رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان کتاب و سنت پر مبنی ہے تو جو جنگی قیدی نہ تبادلہ میں واپس لئے جائیں، اور نہ ہی ان کا زر فدیہ ادا کیا جائے انھیں غلام بنا لیا جائے گا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ چیز سامنے آئی۔ کمیٹی نے مودودی صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ جب تک کوئی حکومت اسلامی حکومت نہ بن جائے اس کی جنگ کو جہاد نہیں قرار دیا جائے گا اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

مودودی صاحب اور جہاد

نہیں، اگر مسلمانوں کی کوئی قومی حکومت مملکت کے جائز مفاد کے لئے اعلانِ جنگ کر دے تو اسے جہاد کہا جائیگا۔

اس پر مودودی صاحب کی توجہ ایک خط کی طرف منعطف کرائی گئی جس میں یہ لکھا تھا کہ

> رہا یہ مسئلہ کہ اگر حکومتِ پاکستان اپنی موجودہ شکل و صورت کے ساتھ انڈین یونین کے ساتھ اپنے معاہدات ختم کر کے اعلانِ جنگ کر بھی دے تو کیا اس کی یہ جنگ جہاد کے حکم میں آجائے گی؟ آپ نے اس بارہ میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ بالکل درست ہے جبتک حکومت اسلامی نظام کو اختیار کر کے اسلامی نہ ہوجائے اسوقت تک اسکی کسی جنگ کو جہاد کہنا ایسا ہی ہے جیسا کسی غیر مسلم کے آزاد کشمیر کی فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے کو جہاد اور اس کی موت کو شہادت کا نام دے دیا جائے۔ مولانا کا جو مدعا ہے وہ یہ ہے کہ معاہدات کی موجودگی میں تو حکومت یا اس کے شہریوں کا اس جنگ میں شریک ہونا شرعاً جائز ہی نہیں۔ اگر حکومت معاہدات ختم کر کے جنگ کا اعلان کر دے تو حکومت کی جنگ تو جہاد پھر بھی نہیں ہوگی تاآنکہ حکومت اسلامی نہ ہوجائے۔

اس پر مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ خط میرے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا۔ لیکن

> اس بارہ میں میاں طفیل محمد (قیم جماعت اسلامی) جنھوں نے اس خط کو لکھا ہے، کی شہادت موجود ہے کہ یہ خیالات ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہی کے ہیں۔ میاں صاحب نے کہا ہے کہ یہ میرے ہی ایک خط کا فوٹو ہے جسے میں نے کسی شخص کو لکھا تھا جس کا نام مجھے اب یاد نہیں۔ (ص ۲۲۶)

غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کی حیثیت

اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ ایک غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں ذیل کے سوال اور جواب رپورٹ میں موجود ہیں:۔

سوال :— (جو امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے کیا گیا) کیا آپ کے خیال میں ایک مسلمان پر کسی کافر حکومت کے احکام کی پابندی لازمی ہے؟

جواب :— ایک مسلمان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار شہری رہ سکے۔

سوال :— کیا ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری بن سکیں۔

جواب :— نہیں۔

اس ضمن میں کچھ اور سوال و جواب بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً

(۱) مولانا ابوالحسنات

سوال :— کیا آپ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو جن کی ہندوستان میں اکثریت ہے، یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مملکت کو ہندو مذہب کے مطابق تشکل کر لیں؟

جواب :— ہاں!

سوال :— اس شکل کی حکومت میں اگر منو کے قانون کے مطابق مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے تو آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟

جواب :— نہیں!

(۲) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

سوال :— اگر ہم پاکستان میں اس قسم کی اسلامی حکومت قائم کریں تو کیا آپ اجازت دیں گے کہ ہندوستان میں ہندو بھی اپنے آئین کو اپنے مذہب کے مطابق مرتب کر لیں؟

جواب :— یقیناً! بلکہ مجھے تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر اس نہج کی حکومت میں مسلمانوں پر منو کے قوانین کی رو سے شودروں اور ملیچھوں کا سا سلوک کیا جائے اور انہیں حقوق شہریت یا حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینے سے محروم قرار دیدیا جائے۔

اس وقت ہندوستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

(۳) ماسٹر تاج الدین صاحب (مجلس احرار)

سوال :— جس قسم کی آئیڈیالوجی آپ مسلمانانِ پاکستان کے سامنے پیش کر رہے ہیں کیا آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اسی قسم کی آئیڈیالوجی پسند کریں گے؟

جواب :— اس قسم کی آئیڈیالوجی کے ساتھ تو وہ لوگ ایک منٹ کیلئے بھی ہندوستان میں نہیں رہ سکیں گے۔

سوال :— تو کیا ایک مسلمان کی آئیڈیالوجی بھی وقتاً فوقتاً اور جگہ بہ جگہ بدلتی رہتی ہے؟

جواب :— نہیں!

سوال :— تو پھر ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی وہی آئیڈیالوجی کیوں نہیں ہونی چاہئے جو آپ کی ہے؟

جواب :— اس کا جواب انہی کو دینا چاہئے۔

(۴) مولانا ابوالحسنات

سوال :— اگر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کا فریضہ کیا ہوگا؟

جواب :— ان کا فریضہ بالکل بدیہی ہے۔ انھیں ہمارا ساتھ دینا چاہئے اور ہندوستان کی طرف سے ہمارے خلاف جنگ میں بالکل حصہ نہیں لینا چاہئے۔

(۵) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ

ان کا فریضہ واضح ہے، انھیں نہ پاکستان کے خلاف لڑائی میں حصہ لینا چاہئے نہ کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہئے جس سے پاکستان کی سلامتی خطرہ میں پڑے۔ (ص ۲۲)

غیر مسلم حکومت تو ایک طرف، خود اپنی حکومت میں بھی مسلمان عمال حکومت کا فریضہ کیا ہوگا اس کے متعلق ذیل کے سوال اور جواب وضاحت کرتے ہیں چنانچہ اس سوال کے جواب میں مولانا ابوالحسنات صاحب نے یہ کہا کہ

احکام کی نافرمانی

اگر کسی پولیس مین کو کوئی ایسا حکم دیا جائے جسے ہم اپنے مذہب کے خلاف سمجھیں تو اس پولیس مین کی ڈیوٹی ہے کہ ایسے حکم کو ماننے سے انکار کر دے۔ پولیس کے سپاہی کی ہی نہیں بلکہ ایک فوجی سپاہی کی بھی یہی ڈیوٹی ہے۔

سوال :— کیا اس پولیس یا فوج کے سپاہی کو یہ حق ہوگا کہ وہ خود ہی یہ فیصلہ کرے کہ اس کے افسر اعلیٰ نے جو حکم اسے دیا ہے وہ مذہب کے خلاف ہے؟

جواب :— یقیناً!

سوال :— فرض کیجئے کہ پاکستان اور کسی دوسری مسلمان مملکت کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے اور پاکستانی سپاہی محسوس کرتا ہے کہ اس باب میں مملکت پاکستان غلطی پر ہے اور فریق مخالف کے خلاف گولی چلانا خلاف مذہب ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ سپاہی اپنے کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دینے میں حق بجانب ہوگا؟

جواب :— ایسی صورت میں اس سپاہی کو علماء سے فتویٰ لینا ہوگا۔ (ص ۲۳)

مُردوں کا چیرنا پھاڑنا

قارئین کی معلومات کے لئے یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا مجد الحامد بدایونی صاحب نے فرمایا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں یہ بھی جائز نہیں ہوگا کہ مردوں کو چیر پھاڑ کر طالب علموں کو اناٹومی کی تعلیم دی جائے۔ (ص ۲۳)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ مباحث جو اسلامی مملکت کے متعلق اس رپورٹ میں آ گئے ہیں۔ رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ ہم نے ان عنوانات پر اس لئے بحث کی ہے کہ اس وقت اسلامی مملکت کے متعلق ذہنوں میں کس قدر انتشار اور خیالات میں تشتت پایا جاتا ہے اور یہ بھی اس مقصد کیلئے کیا ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس تشتت و انتشار کے حقیقی اسباب کو سامنے نہ رکھا جائے گا تو نہ معلوم مستقبل میں پاکستان کو کس قسم کے خطرات کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ

عوام کی حالت

اگر کوئی چیز ایسی ہے جو اس تحقیقات کے دوران میں حتمی طور پر مشہود ہو چکی ہے تو وہ یہ ہے کہ اگر آپ عوام کو اتنا یقین دلا دیں کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے وہ مذہبی طور پر درست ہے یا مذہب نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو آپ ان سے جو جی میں آئے کرا سکتے ہیں۔ اس میں وہ کسی نظم و ضبط، وفاداری، شرافت، اخلاقیات یا تمدنی احساس کا کوئی خیال نہیں کریں گے۔ (صفحہ ۲۳۱)

ازاں بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگرچہ پاکستان ایک اسلامی مملکت نہیں لیکن عوام اسے اسلامی مملکت ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ شور و غل ہے جو تشکیل پاکستان کے بعد سے ہر گوشہ سے اسلام اور اسلامی مملکت کے متعلق مسلسل سنائی دے رہا ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا تصور مسلمان کے ذہن پر صدیوں سے چھایا ہوا ہے۔ اس تصور میں اسے اسلام کا وہ درخشندہ ماضی دکھائی دیتا ہے جس میں مسلمانوں کی سلطنتیں، سندھ سے اسپین تک اور چین سے مصر تک بآں شوکت و سطوت پھیلی ہوئی تھیں۔ مسلمان کے دل میں اسی شوکت رفتہ اور سطوت گذشتہ کی بازیابی کا تصور رہ رہ کر انگڑائیاں لیتا ہے لیکن دوسری طرف حالاتِ حاضرہ کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

مسلمان کی بے بسی!

وہ ماضی کے لبادہ میں لپٹا ہوا، صدیوں کا طومار اپنی پشت پر لادے، مایوس اور حیران اس دوراہے پر کھڑا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس سمت کو قدم اٹھائے۔ دین کی وہ تازگی اور سادگی جس نے کبھی اس کے دل میں عزیمت اور اس کے بازوؤں میں فولادی قوت پیدا کر دی تھی اس سے یکسر چھن چکی ہے۔ وہ ان صلاحیتوں اور اسباب و ذرائع سے محروم ہو چکا ہے جن سے اس نے ماضی میں ملکوں کو فتح کیا تھا۔ نہ ہی اب دنیا میں ایسے ممالک ہی موجود ہیں جنھیں وہ فتح کر سکے۔ وہ اسے سمجھتا ہی نہیں کہ وہ قوتیں جو آج اس کا راستہ روکے کھڑی ہیں، ان قوتوں سے یکسر مختلف ہیں جن سے اسلام کو اپنے ابتدائی ایام میں مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ آج انسانی ذہن نے ان آثار و علامات کے ذریعہ جن کا پتہ نشان خود اس کے اسلاف نے دیا تھا جو نئے راستے اپنے سامنے کھول لئے ہیں اس میں ان کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رہی۔ وہ اس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اس دوراہے پر کھڑا ہے۔ اس انتظار میں کہ کوئی آنے والا آئے اور اسے اس عدم یقین اور تشتت و انتشار کے دلدل سے کھینچ کر باہر نکال لے۔ وہ آنے والے کے انتظار میں اسی طرح کھڑا رہے گا اور اس انتظار کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو ایک تعبیرِ نو عطا کی جائے جس سے اس کی حیات بخش صلاحیتیں اس کے موجودہ بے جان عناصر سے الگ ہو جائیں۔ اس کیلئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں جس سے اسلام ایک عالمگیر نصب العین کی حیثیت سے زندہ رہ سکے اور مسلمان کو اس کی موجودہ حالت سے نکال کر جس میں یہ عہد کہن کی ایک ایسی فرسودہ یادگار بن کر رہ گیا ہے

جو عصر حاضر کے کسی گوشہ میں بھی فٹ نہیں بیٹھتی، اسے حال اور مستقبل کی دنیا میں رہنے کے قابل بنا سکے۔

اس قسم کی جرات آفریں فکر اور سلجھی ہوئی نگاہ کا فقدان، اور معاملات کو سمجھنے اور مردانہ وار فیصلہ کرنے کی عدم صلاحیت ہے جس نے پاکستان میں موجودہ تشتت و انتشار کو پیدا کر رکھا ہے۔ یہ حالت اسی طرح رہے گی اور اس قسم کے حالات بار بار پیدا کرتی رہے گی جن کی تحقیقات ہم کر رہے ہیں، تا آنکہ ہمارے لیڈروں کے سامنے منتہائے نگاہ اور اس کے حصول کے اسباب و ذرائع بالکل واضح طور پر نہ آجائیں۔ اس بات کے سمجھنے کیلئے کسی بلند تصور کی ضرورت نہیں کہ آپ ہزار چاہیں کہ تضادات خود بخود مٹ جائیں، ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اگر آپ متضاد اصولوں کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیں گے تو اس کا نتیجہ انتشار اور بد نظمی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور اگر آپ ان کے حل کیلئے غیر جانبدارانہ روش اختیار کریں گے تو اس سے کوئی زندہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔ جب تک ہمارے لیڈروں کے دل میں یہ خواہش نہ پیدا ہوگی کہ وہ دو متضاد نظریاتِ حیات میں سے صحیح نظریہ کو الگ کرلیں اور ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوگی کہ وہ اس نظریہ کو اپنے لئے منتخب کرلیں، عدم یقین کی یہ کیفیت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ (ص ۲۳۳)

یہ ہے ان مصائب و مشکلات کا حل جسے واضعین رپورٹ نے اہلِ پاکستان کے سامنے پیش کیا ہے۔ آئندہ سطور میں مختصر الفاظ میں طلوع اسلام کا تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

باب دوم:۔ طلوع اسلام کا تبصرہ

جو حضرات طلوع اسلام کا مسلسل مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں انھوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ جن امور سے اس رپورٹ میں بحث کی گئی ہے ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے متعلق طلوع اسلام میں تفصیلی گفتگو آچکی ہو۔ لیکن جن حضرات کی نگاہوں سے وہ مباحث تفصیلی طور پر نہیں گذرے ان کیلئے ہم مختلف عنوانات کی بابت مختصر الفاظ میں کچھ عرض کریں گے۔

تھیاکریسی

رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اس قسم کی اسلامی مملکت قائم ہو جائے جس کا تصور علماء نے پیش کیا ہے تو ایسی مملکت میں نہ عوام کے نمائندوں کی کہیں گنجائش ہوگی، اور نہ ہی قانون سازی کی کوئی ضرورت۔ ضرورت اتنی ہوگی کہ علماء کی ایک مجلس ہو اور جو مسئلہ بھی سامنے آئے اس کی بابت ان علماء سے پوچھ لیا جائے کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔ جو کچھ وہ کہیں اسے ملک میں نافذ کر دیا جائے۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس تصور کی مخالفت کرتا آرہا ہے۔ اس قسم کی مملکت کو تھیاکریسی کہتے ہیں جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء (بالخصوص جماعت اسلامی) اسلامی مملکت کا اس قسم کا تصور پیش ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ زمامِ حکومت ان کے ہاتھ میں رہے۔ مملکت کا یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

قرآنی مملکت

ایک قرآنی مملکت میں قانون کا اولین سرچشمہ وحیِ خداوندی ہوتا ہے اور وہ وحی قرآن کے اندر موجود ہے۔ اس وحی میں زندگی کے اصولی ضوابط دیئے گئے ہیں اور اسے ہر دور کے مسلمانوں پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی

روشنی میں جزئی قوانین اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کریں۔ ان جزئیات کا تعین نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کیلئے نمائندگانِ ملت کا انتخاب بھی عمل میں آئے گا اور ان پر مشتمل مجلسِ قانون ساز بھی ہوگی۔ فرق یہ ہوگا کہ اس مجلس کا کام یہ ہوگا کہ یہ قرآنی اصولوں کے تابع رہتے ہوئے قوانین وضع کرلے۔ اس کی ذمہ داری رئیسِ مملکت پر ہوگی کہ وہ دیکھے کہ یہ مجلس قرآن کی حدود سے باہر تو نہیں جاتی۔

حدیث کی حیثیت جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اس رپورٹ نے ان کی حیثیت کو خود واضح کر دیا ہے جب یہ کہا ہے کہ قانونِ شہادت کی رو سے انھیں یقینی شہادت تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اس امر کی یقینی شہادت نہیں بن سکتی کہ رسول اللہ صلعم نے کیا فرمایا تھا وہ فرموداتِ رسول اللہ صلعم کی سند کیسے قرار پا سکتی ہے؟ لہٰذا اتباعِ سنت کو دین کا جزو قرار دیکر اتباعِ احادیث کا مطالبہ کرنا ایک ایسا کھلا ہوا تضاد ہے جسے ہر دیکھنے والی آنکھ محسوس کر سکتی ہے۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہے۔ اگر رسول اللہ صلعم کا یہ منشا ہوتا کہ حضور کے فیصلوں نے قیامت تک کیلئے غیر متبدل دین کی حیثیت اختیار کرنا ہے تو رسول اللہؐ اپنی احادیث کا ایک مستند مجموعہ امت کو دیکر جاتے۔ یہ مجموعہ، سنت رسول اللہؐ کی یقینی سند قرار پاتا۔ جب رسول اللہ نے خود ایسا نہیں کیا تو کسی شخص کو کیا حق حاصل ہے کہ زید اور بکر کی جمع کی ہوئی روایات کو سنتِ رسول اللہ قرار دیکر انھیں دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ بنا دے، درانحالیکہ وہ روایات قانونِ شہادت پر بھی پوری نہ اترتی ہوں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا یہ منشا ہی نہیں تھا کہ وہ جزئیات جنھیں آپ نے قرآن کے اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مرتب کیا تھا، ابدی قانون کی حیثیت اختیار کر لیں۔

اجماع قرآنی مملکت کے مندرجہ بالا تصور کی رو سے کسی سابقہ دور کے اجماع کی بھی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہتی۔ ہر دور کی مملکت کے نمائندے باہمی مشاورت سے جس فیصلہ پر پہنچیں گے وہی اجماعِ امت کہلائے گا اور وہ اسوقت تک نافذ العمل رہے گا جب تک اسی قسم کا اجماع کوئی دوسرا قانون اختیار نہ کرے۔

افرادِ ملت یہیں سے یہ سوال بھی سامنے آ جاتا ہے کہ اس نظام میں مملکت کے کسی فرد کے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ از خود فیصلہ کرے کہ فلاں حکم دین کے مطابق ہے یا نہیں۔ جب تک یہ نظام قائم ہے اس کا ہر فیصلہ افرادِ مملکت کیلئے واجب التعمیل ہوگا۔ اگر کوئی فرد یہ سمجھتا ہے کہ فلاں فیصلہ دین کے منشاء کے مطابق نہیں تو اسے اس کا حق ہوگا کہ وہ قرآنی اسناد پیش کرکے ملت کو اپنے ساتھ متفق کرلے اور اس فیصلہ کو بدلوانے کی آئینی روش اختیار کرے۔ جب تک یہ فیصلہ اس طرح بدلا نہ جائے اسے خود اس کی خلاف ورزی کرنے یا لوگوں کو اس کی خلاف ورزی پر ابھارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمارے مولوی صاحبان کا یہ فیصلہ کہ اگر پاکستان اور ہندوستان میں لڑائی چھڑ جائے اور ایک پاکستانی سپاہی یہ سمجھے کہ یہ چیز خلافِ دین ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ ایسا حکم ماننے سے انکار کر دے یا اس کیلئے علماء سے فتویٰ طلب کرے، انارکی یا تھیوکریسی کہلا سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی خصوصیت قرار نہیں پا سکتا۔

مسلمان کسے کہتے ہیں

اس کے بعد یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ کمیٹی نے جو کچھ پوچھا تھا وہ بالکل سیدھی سی بات تھی کہ جب تم کہتے ہو کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم کی حیثیت الگ الگ ہوگی تو وہ کونسا امتیازی خط ہے جس سے ایک مسلم، غیر مسلم سے متمیز ہو سکے۔ قرآن نے اس امتیازی خط کو کفر اور ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ رہ گیا کہ قرآن کی رو سے ایمان کسے کہتے ہیں۔ یہ سوال کوئی ایسا مشکل نہیں جس کے جواب کے لئے پہلے سے نوٹس درکار ہو یا جوابات میں کوئی اختلاف ہو، بشرطیکہ جواب دینے والے کو یہ معلوم ہو کہ دین کے متعلق سوالات کا جواب کہاں سے ملا کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے جواب صاف ہے کہ

جو شخص اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور آخرت پر اس طرح یقین رکھے جس طرح قرآن نے کہا ہے۔ وہ مومن ہے۔

مرتد کی سزا

اس کے بعد تحقیقاتی کمیٹی نے یہ سوال پوچھا تھا کہ جو شخص مسلمان نہ رہے اس کی کیا صورت ہوگی۔ اس کے جواب میں تمام مولوی صاحبان نے اپنے اسی غیر قرآنی عقیدہ کو دہرایا ہے کہ وہ مرتد ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ جیسا کہ ہم ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "تین اہم عنوانات" میں بالتفصیل لکھ چکے ہیں یہ عقیدہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور اسلام کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے اس عقیدہ کو اس لئے وضع کر رکھا ہے کہ لوگوں کی موت اور زندگی تک کا اختیار بھی انہی کے ہاتھ میں رہے تاکہ ان کے استبداد کے سامنے کوئی آنکھ تک نہ اٹھا سکے۔ بہرحال قرآن کی رو سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مسلمان نہیں رہتا اس کا شمار غیر مسلموں کے زمرہ میں ہو جاتا ہے۔

غیر مسلموں کی حیثیت

اب رہا یہ سوال کہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی تو اس کیلئے ایک بات واضح ہے کہ چونکہ اس مملکت میں قانون سازی کا اصول یہ ہے کہ یہ سب کچھ قرآن کے اصولوں کے تابع حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے گا، اس لئے ظاہر ہے کہ جو شخص (غیر مسلم) اس اصلِ اصول ہی کو نہیں مانتا۔ اس قانون سازی یا اس کی تعبیرات کے کام میں اس کے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فرق کے بعد ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے جو ایک بڑی سے بڑی مملکت اپنے افراد مملکت کو دے سکتی ہے۔ نہ صرف ان کے مذہب، معابد، جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت بلکہ ان کی تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری بھی اسلامی مملکت پر ہوگی۔ اگر کوئی غیر مسلم مملکت اپنے ہاں کی مسلم رعایا کو اسی قسم کے حقوق دیدیتی ہے تو ہم اس سے مطمئن ہوں گے۔ ان حقوق کے بعد وہاں کے مسلمانوں کیلئے ضروری ہوگا کہ جب تک وہ ہاں میں پرامن شہریوں کی حیثیت سے رہیں۔ اگر وہ وہاں رہنے پر مطمئن نہ ہوں اور اپنے دل میں صحیح اسلامی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تڑپ رکھتے ہوں تو انہیں کسی اسلامی مملکت کی طرف آجانا ہوگا۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ بین الاقوامی قوانین کے ذریعہ اس قسم کے انتقال آبادی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے۔

جنگ کے قیدی

جہاں تک جنگ کے قیدیوں کا تعلق ہے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "تین اہم عنوانات" میں صراحت سے

لکھا جا چکا ہے کہ قرآن کی رو سے ان قیدیوں کو فدیہ لیکر یا احساناً رہا کرنا ہوگا۔ جب تک یہ قید میں رہیں گے ان سے انسانیت کا پورا پورا سلوک کیا جائے گا۔ اگر یہ رہا ہو کر اپنے ملک میں نہ جانا چاہیں تو حقوق شہریت کی شرائط کے ساتھ یہ اسلامی مملکت کے آزاد باشندے ہو جائیں گے۔

جہاد جہاد کے متعلق یہ ظاہر ہے کہ جب قرآن کی رو سے جبر کا ایمان، ایمان ہی کہلا نہیں سکتا تو بزور شمشیر کسی کو مسلمان کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس قسم کا "جہاد" نہ کبھی پہلے جائز تھا اور نہ اب جائز قرار پا سکتا ہے۔ البتہ حقوق انسانیت کے تحفظ کیلئے تلوار کا استعمال اسلام میں پہلے بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا اور اب بھی عند الضرورت نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوگا۔ قرآن کے اس قانون کو کوئی منسوخ قرار نہیں دے سکتا۔

تبلیغ کا حق باقی رہا یہ کہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت ہوگی یا نہیں تو اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو مملکت کے امن اور شرافت کے تقاضہ کیلئے ضروری ہیں، ہر شخص کو اس کے عقائد کی تبلیغ کا حق حاصل ہوگا۔ نہ صرف اپنی مملکت کے غیر مسلموں کو بلکہ دوسری مملکتوں کے غیر مسلم بھی اگر چاہیں تو اسلامی مملکت میں انہیں اس کا حق حاصل ہوگا بشرطیکہ مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہو کہ وہ ان کے ہاں اسلامی نظام کی تبلیغ کر سکیں۔ واضح رہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے قرآن کی رو سے ان کے ہاں فرقہ بندی شرک ہے، اسلئے ایک صحیح اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور ان

مسلمان فرقے فرقوں کے عقائد کی تبلیغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب جبکہ مسلمانوں میں اتنے فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان کا کیا علاج کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ سوال بہت بڑا ہے لیکن اس کا جواب بدیہی ہے کہ اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان اپنی غیر اسلامی زندگی کو چھوڑ کر اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے متمنی ہوں گے تو وہ جس طرح اور غیر اسلامی چیزوں کو چھوڑیں گے فرقہ پرستی کے کھلے ہوئے شرک کو بھی چھوڑنا ہوگا۔ اس وقت یہ چیز واقعی ہوا بن کر ڈراتی ہے لیکن اگر قرآن کو دین کا محور مان لیا جائے تو اس ہوا کی حیثیت الف لیلہ کے خیالی جنات سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔ یہ بات ہم اپنے تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ ہماری حقیری کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت طلوع اسلام کی "برادری" میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس سے پہلے بڑے متشدد قسم کے شیعہ، وہابی، مقلد، بریلوی، چکڑالوی وغیرہ تھے لیکن آج وہ ان تمام نسبتوں کو چھوڑ کر صرف مسلمان کہلانے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ کوشش بڑے محدود پیمانے پر ہوئی ہے اور بڑی ہی بے سروسامانی کی حالت میں لیکن اس کے باوجود اس کے نتائج اس قدر تسلی بخش اس لئے حاصل ہو گئے ہیں کہ بہ توفیق ایزدی طلوع اسلام نے اس جرأت سے کام لیا ہے جس کے فقدان کا رونا واضعین رپورٹ کے دل درد مند نے خون کے آنسوؤں سے رویا ہے۔ طلوع اسلام اگر چاہتا تو اس وقت سارے پاکستان میں سب سے زیادہ مقبول ادارہ ہو سکتا تھا۔ کیا عوام اور کیا خواص، یہ سب کو اپنا گرویدہ بنا سکتا تھا لیکن اس نے اس سستی مقبولیت کے بجائے قرآن کی صحیح تعلیم کو پیش کرنے کی راہ کو ترجیح دی۔ اس کی زندگی میں کئی مراحل ایسے آئے جس میں بڑی بڑی جاذبیتوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور اس مقبولیت کے مقابلہ میں ہر طرف سے طعن و تشنیع و

اعتراضات وطنزیات کا نشانہ بننا گوارہ کرلیا۔ محض اس لئے کہ کبھی تو ایک آواز ایسی اٹھنی چاہیے جو مسلمان سے یہ کہے کہ قُومُوا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا خدا کے لئے ایک ایک دو دو ہو کر ہی کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ طلوعِ اسلام نے صرف اتنی ہمت سے کام لیا ہے اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود کم ازکم ایسے نتائج پیدا کر دکھائے ہیں جو بڑی بڑی مقبولِ عام جماعتوں کے حصہ میں نہ آسکے ہیں نہ آسکیں گے۔

جرأت کا فقدان

اس رپورٹ میں تو اس کا ذکر آج آیا ہے لیکن طلوعِ اسلام مسلسل چھ برس سے کہتا چلا آرہا ہے کہ پاکستان کی ہر روز بڑھنے والی کمزوری اور بالآخر بدبن مآل کار تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں کے اربابِ حل و عقد میں جرأت کا فقدان ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ زمانے کے تقاضے انھیں آگے کی طرف کھینچتے ہیں لیکن عوام میں غیر مقبول ہو جانے کا دھڑکا انھیں پیچھے کی طرف دھکیلتا ہے۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ کھلے طور پر زبان پر نہیں لاتے کہ اس سے ان کی مقبولیت میں فرق آجائے گا۔ اور جو کچھ عوام چاہتے ہیں اس پر یہ لوگ دل سے یقین اس لئے نہیں رکھتے کہ حالات کا تقاضا ان کے بالکل خلاف جاتا ہے۔ چھ برس سے اس ملک میں یہ رسہ کشی جاری ہے اور اس کے اندر بندھی ہوئی قوم کی ہڈیاں اور پسلیاں ایک ایک کرکے ٹوٹ چکی ہیں۔ طلوعِ اسلام ان حضرات سے ایک بار نہیں بیسیوں مرتبہ کہہ چکا ہے کہ اگر آپ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ یہاں کا مُلا جس چیز کو مذہب کہتا ہے، وہ انسان کو آدمیت کی صف میں جگہ دینے کے بھی قابل نہیں چھوڑتا تو کھلے بندوں اس کا اعلان کیجئے اور خدا کی کتاب کو لیکر اس کی روشنی میں مملکت کا نظام متشکل کر لیجئے۔ اور اگر آپ کا یہ یقین ہے کہ یہ سب کچھ عہدِ کہن کی باتیں ہیں تو پھر جرأت سے کام لیجئے اور کہئے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ مملکت کے امور مصلحت کے تقاضوں کے مطابق طے پائیں گے۔ اس سے اور نہیں تو آپ پاکستان کو مغرب کی غیر مذہبی مملکتوں کی صف میں تو لے آئیں گے۔ یہ موجودہ روش جس میں آپ نہ شتر بنتے ہیں نہ مرغ، اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ہم نہیں کہہ رہے خود خدا کا ارشاد ہے جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے: افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذٰلک منکم الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم القیٰمۃ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵) جن لوگوں کی بھی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھکر چلتے ہیں ان کا انجام ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ اگر اس مملکت میں کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو گیا جس نے اس قلندرانہ جرأت سے کام لیا تو وہ اس قوم کو اس دلدل سے نکالکر باہر لیجائے گا۔ اگر اس کے ہاتھ میں قرآن ہوا تو وہ اس قوم کو اس مقام پر لے جائے گا جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہاں نوعِ انسانی کی امامت ملا کرتی ہے اور اگر وہ قرآن کے بغیر ہوا تو ہر چند ہمارے لئے (جو اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کو دیکھنے کے متمنی ہیں) یہ صورتِ حالات بیحد رنج دہ ہوگی لیکن موجودہ صورت کی نسبت وہ حالت بہرحال بہتر ہوگی کیونکہ اس سے اور کچھ نہیں تو یہ قوم اس جذام سے تو نجات پا جائے گی جس میں یہ صدیوں سے مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پھر یہی قدم قرآنی نظام کی تشکیل کا پیش خیمہ بن جائے۔ بہرحال ضرورت ہے ایک جرأت مندانہ اقدام کی۔ لیکن جس ملک میں یہ کہا جاتا ہو کہ ڈیماکریسی سے مفہوم یہ ہو کہ عوام کی اکثریت جو چاہے کر دیا جائے، وہاں اس قسم کی جرأت کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اس رپورٹ نے سب سے بڑی خدمت جو کی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے بتایا ہے کہ مذہبی شوریدہ سری سے پاکستان کو کن خطرات کا خدشہ ہے اس میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ مذہب پرست عوام کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں کسی معاملہ کے متعلق کہدیا جائے کہ وہ شریعت کا حکم ہے۔ اس کے بعد ان سے جو جی میں آئے کرا لیجئے۔ یہی وہ حربہ ہے جسے ہمارے ہاں کی سیاسی جماعتیں مذہب کے مقدس لباس میں استعمال کر رہی ہیں اور اسقدر تباہیوں کا باعث بن رہی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں مجلس احرار اور دوسرے قومیت پرست مولوی صاحبان تحریکِ پاکستان کی سخت مخالفت کرتے تھے اور یہ سب کچھ شریعت کے نام پر ہو رہا تھا۔ اسوقت وہ یہ کہتے تھے کہ پورے ہندوستان کو ایک ملک تصور کر کے اس میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک حکومت بنانے میں اسلام کی سرفرازی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ آج یہی جماعت کہہ رہی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ شودروں اور ملیچھوں کا سلوک ہو رہا ہے اور ہندو ایسا کرنے میں حق بجانب ہے یہ ارشاد بھی ان کے امیر شریعت ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔

جماعت اسلامی اس زمانہ میں یہ کہہ کر پاکستان کی مخالفت کیا کرتی تھی کہ ایک الگ خطۂ زمین میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے اور ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمان اگر صحیح مسلمان بن جائیں تو وہ ہندوؤں پر بھی غالب آسکتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ پاکستان کی مخالفت کی جائے اور ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں پر غالب آیا جائے۔ آج انھیں کی شریعت یہ کہہ رہی ہے کہ صالحین کی یہ جماعت پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کریگی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ وہاں کے ہندو شودروں کا سا سلوک کرنے میں بالکل حق بجانب ہوگا۔ واضح رہے کہ آج ہندوستان میں جماعت اسلامی بھی موجود ہے اور مودودی صاحب اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ شودروں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ وہاں ان کی جماعت مسلمانوں کو شودروں کی سطح سے اٹھا کر ہندوؤں پر غالب بنا دینے کیلئے ایک حرف تک بھی زبان پر نہیں لاتی۔ نہ ہی یہ حضرات وہاں جا کر ایسا کچھ کرنے کا خیال کرتے ہیں۔ البتہ یہاں بیٹھے بیٹھے ہندوستان کے مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں اپنی حکومت کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دینا۔ درآنحالیکہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ان کی ہمدردیوں کا یہ عالم ہے کہ مودودی صاحب کے فتوے کے مطابق ان سے بیاہ شادی بھی جائز نہیں ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کی شریعت۔ یہ ہے ان لوگوں کی سیاسی بصیرت۔ یہ ہے ان لوگوں کی دیانت اور یہ ہے ان لوگوں کی اصول پرستی۔ لیکن اس کے باوجود جب یہ لوگ خدا اور رسول کا نام لیکر عوام کو بھڑکاتے ہیں تو عوام یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ ان کے کہنے میں آکر ہر قسم کا طوفان مچا دیتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ طلوع اسلام شروع سے یہ دعوت دیتا چلا آرہا ہے کہ جذبات پرستی کی رو میں مت بہے جاؤ۔ کھڑے ہو کر سوچو کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

ایک وضاحت رپورٹ میں ایک مختصر سا ٹکڑا ایسا ہے جس سے کچھ غلط فہمی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے صفحہ ۲۳۲ پر لکھا ہے:۔

اگر ہمارے لیڈر اسے نافذ کرنے کیلئے موجود نہ بھی ہوں تو بھی وہ بلند عقیدہ جسے اسلام کہتے ہیں باقی رہے گا۔ وہ ہر فرد کے دل میں ہے، اسکی روح میں ہے اس کے زاویۂ نگاہ میں ہے۔ وہ اس کے گہوارہ سے لیکر لحد تک اس کے خدا اور دیگر افراد انسانیہ کے ساتھ روابط میں ہر جگہ

موجود رہتا ہے۔ ہمارے سیاسی مدبرین کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر خدا کے احکام کسی شخص کو مسلمان نہیں بنا سکتے یا مسلمان کو مسلمان نہیں رکھ سکتے، تو ان کے قوانین مملکت کبھی ایسا نہیں کر سکتے (ص ۲۳۲)

اس سے ممکن ہے کوئی یہ نتیجہ اخذ کرلے کہ واضعین رپورٹ کے نزدیک مذہب ایک ذاتی عقیدہ ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ایسا نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا۔ کیونکہ چند ہی صفحات پہلے واضعین رپورٹ نے لکھا ہے کہ ہم اسلام کو ایک ایسا ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں جو حسب ذیل پانچ شعبوں کو محیط ہے۔

(۱) اجزائے ایمان

(۲) مذہبی شعائر و مناسک جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔

(۳) اخلاقیات

(۴) معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام۔ اور

(۵) قانون

اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔

ختم نبوت

جس بنیاد پر اس سارے سوال کو اٹھایا گیا تھا وہ مسئلہ ختم نبوت تھا۔ اس رپورٹ میں اس سوال کا فیصلہ کن جواب نہیں دیا گیا کہ اس بارہ میں احمدیوں کے دلائل برسرحق ہیں یا غیر احمدیوں کے۔ کیونکہ جیسا کہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے اس سوال کا فیصلہ کن جواب متعین کرنا، اس کمیٹی کے ذمہ تھا ہی نہیں۔ (اگرچہ کمیٹی کے ممبروں نے اپنے ذاتی عقیدہ کو واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ سلسلۂ انبیاء میں رسول اکرم صلعم آخری نبی تھے اور ان پر سلسلۂ وحی ختم ہو گیا۔ ص ۲۰۶)

طلوع اسلام اس حقیقت کو تفصیلی طور پر لکھ چکا ہے اور قرآن کی نصوص صریحہ سے حتمی اور یقینی طور پر ثابت کر چکا ہے کہ قرآن کریم خدا کی آخری وحی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ انبیاء و رسل کی آخری کڑی ہیں جن کے بعد کوئی نبی اور رسول آ ہی نہیں سکتا۔ (نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں) قرآن کی رو سے ہمارے ان دلائل کی تردید نہ کسی سے اس وقت تک بن پڑی ہے نہ اس کے بعد بن پڑے گی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام اس حقیقت کو بھی بار بار بیان کرتا چلا آ رہا ہے کہ اجرائے نبوت کیلئے زمین خود ہمارے معروجہ مذہب کی تیار کردہ ہے جس کے علمبردار ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ ہم اس موقعہ پر اس حقیقت کو پھر دہراتے ہیں۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔

دنیا میں ایک ذریعۂ علم ہے انسان کی عقل۔ انسان مختلف چیزوں پر غور کرتا ہے، مختلف تجربے کرتا ہے، تاریخ میں جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اس کو سامنے رکھتا ہے۔ ان مشاہدات و تجربات کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اسے کہتے ہیں عقلی ذریعۂ علم۔

لیکن ایک اور ذریعۂ علم ہے جس میں انسان اپنی عقل کی رو سے معلومات حاصل نہیں کرتا۔ یہ معلومات اسے خدا کی طرف سے از خود ملجاتی

ختم نبوت کے معنی

ہیں۔ اس کا نام وحی ہے۔ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اس ذریعۂ معلومات کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا اور جتنی معلومات

اس ذریعہ سے دی جانی مقصود تھیں انھیں قرآن کے اندر محفوظ کر دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ختم نبوت کے بعد انسان کے پاس دو ہی چیزیں رہ گئیں۔ ایک قرآن کے اندر دی ہوئیں معلومات اور دوسرے اسکی اپنی عقل۔ ختم نبوت کے بعد اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ انسان کو خدا کی طرف سے ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اسکی عقل کی حاصل کردہ نہیں ہوتیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ ختم نبوت کا قائل نہیں۔ وہ اس طرح معلومات حاصل ہونے کا نام کچھ ہی رکھ لے، لیکن نام کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ پھر سوچئے کہ جسے نبوت کہتے ہیں وہ اسکے سوا اور کیا ہے کہ انسان کو خدا کی طرف سے از خود ایسی معلومات ملتی ہیں جنھیں اس شخص نے عقل کی رو سے حاصل نہیں کیا ہوتا۔

مسلمان (یعنی ہمارے مروجہ مذہب کے پیرو) ایک طرف ختم نبوت کے بھی قائل ہیں اور دوسری طرف اس کے بھی قائل ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے بعد بھی بعض لوگوں کو خدا کی طرف سے براہ راست معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ان کی عقل کی حاصل کردہ نہیں ہوتیں۔ وہ اس کا نام الہام یا کشف یا مبشرات وغیرہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کا نام بدل دینے سے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حالانکہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اس عقیدہ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہی نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے قریب قریب تمام فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات اپنے ائمہ کرام کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں (اور حق یہ ہے کہ اس باب میں ان کی پوزیشن دوسروں سے زیادہ صاف ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ائمہ کے الہام اور رسول کی وحی میں حجت اور سند ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کرتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے ائمہ کو دین میں وہی اختیارات حاصل ہیں جو رسول اللہ صلعم کو حاصل تھے۔) غیر شیعہ مسلمان اپنے بزرگوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انھیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگرچہ اسلام میں اس عقیدہ کا سرچشمہ شیعی معتقدات ہی ہیں لیکن ان کے ہاں یہ چیز صرف ان کے ائمہ کرام تک محدود سمجھی جاتی ہے اور دوسرے مسلمانوں میں اس کا دروازہ سب کیلئے کھل گیا ہے۔

الہام حجت نہیں

غیر شیعہ مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم الہام کو نہ صاحب الہام کیلئے حجت مانتے ہیں اور نہ دوسروں کے لئے۔ ذرا سوچئے کہ اس سے بات کیا بنی۔ بات یوں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے عام قانون سے الگ ہٹ کر کسی ایک برگزیدہ انسان کو کچھ معلومات براہ راست عطا کرتا ہے اور ان معلومات کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ نہ وہ خود اس شخص کیلئے کسی معاملہ میں دلیل اور سند بن سکتی ہیں اور نہ ہی ان کیلئے جو یہ ملتے ہیں کہ یہ معلومات اس شخص کو خدا کی طرف سے بذریعۂ الہام ملی تھیں۔ سوچئے کہ اس قسم کا طریق کار اختیار کرنے سے خدا کا کیا مقصد تھا اور انسانوں کو اس سے کیا ملا۔ بجز اس کے کہ یہ مفت میں عوام کی گمراہی کا ذریعہ اور امت میں تشتت و انتشار کا موجب بن گیا۔ اگر آپ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیں گے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو جائے گی کہ اگرچہ یہ لوگ زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ہم الہام کو حجت نہیں مانتے لیکن عملاً یہ اسے حجت اور سند مانتے ہیں۔ (مثلاً) ابھی اگلے دنوں صدق جدید (لکھنؤ) میں کراچی کے ایک صاحب کا خط شائع ہوا تھا جو سید سلیمان ندوی مرحوم کے قریبی تلامذہ میں سے تھے اس میں لکھا تھا کہ سید صاحب نے ایک دفعہ یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی تفسیر بیان القرآن کے مشکل مقامات کو سہل کر دینا چاہتے ہیں۔ مولانا تھانوی مرحوم کے خلفاء میں سے بعض نے یہ کہہ کر اسکی مخالفت کی کہ مولانا کے الفاظ الہامی ہیں اسلئے وہ اپنی جگہ سے بدلے نہیں جا سکتے۔ چنانچہ سید صاحب کو یہ خیال چھوڑنا پڑا۔ یہ ظاہر ہے کہ نہ مولانا تھانوی مرحوم اس کے مدعی تھے اور نہ ہی تھانوی مدرسہ کے متوسلین اس کے قائل ہیں کہ الہام سند اور حجت ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود عملاً یہی ہوا کہ ان کے الہام کو غیر متبدل قرار دیدیا گیا۔ ہم نے یہ واقعہ محض تمثیلاً لکھا ہے ورنہ الہام ماننے والوں کے ہاں ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔

الہام کی دلیل

الہام کے جواز میں بعض لوگ یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے دل میں وحی کے ذریعہ کچھ باتیں ڈالدی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ غیر نبی کو بھی خدا کی طرف سے براہِ راست معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس نکتہ کے متعلق ہم طلوعِ اسلام میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں کہ لفظ وحی کے معنی کیا ہیں اور قرآن میں یہ لفظ کس کس مفہوم کیلئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ کہ قرآن میں لکھا ہے کہ شہد کی مکھی کی طرف بھی وحی ہوتی ہے اور آسمان اور زمین کی طرف بھی۔ لیکن قطع نظر اس بحث کے قرآن نے مومنین کی صفات اور خصوصیات کا متعدد مقامات پر تفصیلی ذکر کیا ہے ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں لکھا کہ ان میں سے ایسے بھی ہوں گے جن کی طرف ہم وحی یا الہام بھیجا کریں گے۔ لہٰذا اُمِّ موسیٰ یا حضرت مسیحؑ کے حواریین کی مثال سے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ کے بعد آپ کی امت کے لوگوں کو الہام ہوا کریگا۔ جبکہ قرآن نے اس کی بابت کہیں بھی نہیں لکھا کہ ایسا ہوا کریگا۔ دوسرے یہ کہ اُمِّ موسیٰ اور حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی وحی کے متعلق تو ہم نے اسلئے مان لیا کہ ہمیں خود خدا نے (قرآن میں) یہ بتا دیا کہ انکی طرف وحی ہوئی تھی لیکن رسول اللہ کے بعد اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو اسکے متعلق کون بتائیگا کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہوئی ہے؟

بہرحال یہ ہے وہ بنیادی عقیدہ جسکی رو سے نبوت کا دروازہ بدستور کھلا رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں یہ کہنا کہ ہم الہام کو حجت نہیں مانتے خدا کے اس طریق کار کو بالکل مہمل بنا دیتا ہے۔ مرزا غلام احمد نے یہی بات کہی کہ خدا الہام کے ذریعہ حق اور باطل کو واضح کر دیتا ہے لہٰذا الہام سب سے بڑی سند اور قطعی حجت ہوتا ہے۔ الہام کے امکان کو مان لینے کے بعد یہ دعویٰ معقول ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس تمام خرابی کی بنیادی وجہ الہام کا غیر قرآنی عقیدہ ہے اور جب تک یہ باقی رہے گا یہ خرابی بھی باقی رہے گی۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم اپنے اعتقادات و نظریات کو قرآن کے مطابق کر لیں۔ قرآن کی رو سے جو کچھ ماوراء عقل سرچشمہ سے ملنا تھا وہ نبی اکرم صلعم کی وساطت سے مل گیا اور قرآن کے اندر محفوظ ہو گیا۔ اب دنیا میں کسی انسان کو ماوراءِ عقل ذریعہ سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اب انسانی رہنمائی کیلئے قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ ہے۔ اس روشنی میں جسقدر اس آنکھ سے کام لیا جائے گا زندگی کے راستے صاف ہوتے چلے جائینگے۔ یہ ہے صحیح مفہوم ختمِ نبوت کا۔

کشف و کرامات

باقی رہا یہ کہ بعض لوگوں سے کرامات سرزد ہوتی ہیں اور بعض عجیب عجیب قسم کی ایسی باتیں کرتے ہیں جو عام عقل میں نہیں آسکتیں تو یہ چیز فنی ہے۔ انسان کے اندر ایسی قوتیں ہیں (مثلاً قوتِ خیال) جن کی اگر ایک خاص طریقہ سے نشو و نما کر لی جائے تو اس سے اس قسم کی باتیں ہونے لگتی ہیں جو ان انسانوں کو حیرت میں ڈالدیتی ہیں جن کی ان صلاحیتوں کی اس قسم کی نشو و نما نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ چیزیں کسی ماوراءِ عقل ذریعہ سے خدا کی طرف سے نہیں ملتیں۔ یہ محض عجوبہ پرستی ہے جسے نہ دین سے تعلق ہے نہ عقل سے۔

آنیوالے کا عقیدہ

باقی رہا کسی آنیوالے کا عقیدہ۔ تو رسول اللہ کے بعد کسی اور آنیوالے کا تصور ہی ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ لہٰذا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہے ختمِ نبوت کا صحیح مفہوم۔ اگر اس قسم کے دھچکے جو پچھلے سال پنجاب کی سرزمین کیلئے وجہ تزلزل ہوئے تھے مسلمانوں کو اتنا سوچنے پر آمادہ کر دیں کہ ہمارے معتقدات قرآن کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان بیگناہوں کا خون جنھوں نے مولویوں کی باتوں میں آکر اپنی جانیں دیدی تھیں رائیگاں نہیں جائیگا۔ اور اگر ہم اس کے بعد بھی اپنے غیر قرآنی عقائد کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے رہے تو پھر ان تنذیرات کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا اور تباہی کی

یتیم پوتا محجوب نہیں ہوسکتا

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ جو آجکل زیر بحث ہے تعجب ہے کہ زیادہ تر اہلِ حدیث ہی مولوی اس کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ کبھی محدثین نے شروع سے آجتک اس قانونِ وراثت پر غور و فکر کی نظر نہیں ڈالی اور جو کچھ حنفی فقہاء نے لکھدیا اسی کو یہ برابر تسلیم کرتے چلے آئے اور آج بھی سراجی ہی کو یہ اپنا قانونِ وراثت تسلیم کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں جو عربی زبان میں ہے اور مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے یہ ثابت کر دیا ہے کہ علماء سے اس فن کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں اور اس کے بہت سے اصول قرآن کے خلاف جاتے ہیں جس سے یہ سارا فن تقریباً غلط ہو گیا ہے اور اس کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ آج یہی اہلِ حدیث مولوی یتیم پوتے کی محجوبیت کے وکیل بنے ہوئے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کی انجمن اہل حدیث کے مرکزی اخبار الاعتصام گوجرانوالہ میں ان کی تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں اور افسوس ہوتا ہے۔ اخبار مذکور کی ۹ اپریل کی اشاعت میں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے "الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلاولی رجل ذکر"۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ یتیم پوتا محجوب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں آنحضرتؐ نے حکم دیا ہے کہ جن کے حصے قرآن میں معین ہیں ان کے حصوں کو دیکر جو کچھ بھی باقی رہے وہ قریب ترین مرد نر کو دیدو۔ وہ اس کو واضح اور مدلل اصول قرار دیکر اس کی روشنی میں پوتے کا مسئلہ حل کرتے ہیں۔

میری نظر میں یہ حدیث نہ واضح ہے نہ مدلل اصول ہے بلکہ صحیح بھی نہیں ہے یعنی اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط ہے۔ کیونکہ ائمہ جرح و تعدیل نے لکھا ہے کہ حدیث کے غلط ہونے میں اگر رکاکت ہو تو اس کے کذب کی دلیل ہے۔ اس حدیث میں "رجل ذکر" کا لفظ آیا ہے جو ہم کو سارے عربی ادب میں کہیں نظر نہیں پڑا نہ ہم نے کسی عرب کو یہ لفظ بولتے ہوئے سنا۔ رجل کے ساتھ ذکر کی قید کس لئے ہے؟ کیا رجل انثیٰ بھی ہوتا ہے؟ ایسا رکیک لفظ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو افصح العرب والعجم تھے بول ہی نہیں سکتے تھے۔ اب رہا یہ دعویٰ کہ یہ حدیث واضح اور مدلل اصول ہے تو چند مثالوں سے اس کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثال ۱

زید

بیٹا پوتا

یہ صورت متنازعہ فیہ ہے۔ اس میں کون سے اہل فرائض ہیں جن کو ان کے حصے دینے کے بعد قریب ترین مرد نر کو بقیہ دیا جائے؟ مثال ۲

زید

بیٹی دادا حقیقی بھائی

اس صورت میں بیٹی کو نصف حصہ دینے کے بعد دادا اور حقیقی بھائی ہیں جو دونوں زید کے ساتھ اس کے باپ کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں۔ اب آپ اپنے اس "واضح اور مدلل اصول" سے بتائیے کہ بقیہ ان دونوں میں سے کس کو دیا جائیگا اور کس دلیل سے دیا جائے گا۔ حدیث میں تو صرف واحد مذکر رجل ہے۔ اگر رجلان یا رجال ہوں تو یہ حدیث کیسے کام دیگی۔ مثال ۳

زید

بیٹی — دادا — پڑنانی

اس صورت میں بیٹی کو حصہ دینے کے بعد اس حدیث کی رو سے بقیہ دادا کو ملنا چاہئیے کیونکہ وہ اولیٰ رجل ذکر ہے مگر پڑنانی بھی حصہ پاتی ہے پھر یہ واضح اور مدلل اصول کہاں گیا؟۔ مثال ۴

زید

دو بیٹیاں — بہن — بھتیجا

اس مثال میں دو بیٹیوں کو دو ثلث دینے کے بعد اس حدیث کی رو سے بقیہ بھتیجے کو ملنا چاہئے لیکن مل گیا بہن کو۔ اور یہ "واضح اور مدلل اصول" بیکار رہا۔ مثال ۵

زید

بیٹی — پوتی — بہن — بھتیجا

اس صورت میں بیٹی کو نصف دینے کے بعد بقیہ ترکہ اس "واضح اور مدلل اصول" کے مطابق بھتیجے کو ملنا چاہئے۔ لیکن فقہ کہتی ہے کہ بقیہ میں سے ⅙ تکملۃ لثلثین پوتی کو ملے گا۔ اور دوسری حدیث "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" "بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بناؤ" کہتی ہے کہ بقیہ کل بہن کو ملے گا۔ اب مولوی صاحبان کے لئے اس دلدل سے نکلنے کی صورت نہیں رہی۔ یہ در اصل غلط اصول اور جھوٹ کا دلدل ہے۔ اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ مکذوب روایت ہے کیونکہ قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔

ان امرءٌ هلك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك

اگر ایک آدمی مرگیا جس کے کوئی اولاد نہیں اور اس کے ایک بہن ہو تو بہن کو اس کے متروکہ کا نصف ملے گا۔

یعنی قرآن بہن کو اس وقت حصہ دلاتا ہے جب مورث نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو اور یہ حدیث اولاد کے ساتھ بہن کو حصہ دلاتی ہو اس لئے قرآن کے بالکل خلاف ہے اور کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ابن عباسؓ تو فرماتے تھے کہ اللہ نے تو کہا کہ بہن کو اس وقت حصہ ملے گا جب میت نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو اور تم کہتے ہو کہ اولاد ہو تب بھی ہم بہن کو دیں گے۔ غرض اسی قسم کی مکذوب روایتیں ہیں جو ان لوگوں نے بنائی ہیں جو قرآنی قانون وراثت کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے۔

اب قرآن سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ وہ کہتا ہے۔ للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون۔ وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر نصيبا مفروضا۔ جو کچھ باپ ماں اور اقرب نے چھوڑا ہے اس میں سے مردوں کو حصہ ملے گا اور اس میں سے عورتوں کو حصہ ملے گا خواہ کم ہو یا زیادہ۔ معین حصہ۔ باپ اور ماں کا ذکر احتراماً ہے وہ بھی اقرب میں داخل ہیں کیونکہ ان سے بڑھ کر اقرب کون ہوگا۔ اس لئے اصول یہ ہوا کہ اقرب جو کچھ چھوڑ جائے اس میں سے ان مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا جن کا وہ اقرب ہو۔ اقرب صیغۂ تفضیل ہے یعنی مورث ان کا سب سے زیادہ قریبی ہو۔ اس کا مفہوم یہ ہے وہ لوگ میت کے وارث ہوں گے جو اس سے بلا واسطہ رشتہ رکھتے ہوں یا بواسطہ لیکن بروقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔ مثال ۱

مورث ان سب کا اقرب ہے اسلئے یہ سب قرآن کے مطابق اس کے وارث ہوں گے اور قرآن کے معین کئے ہوئے حصے پائیں گے۔ اس مثال میں ورثہ مورث کے ساتھ بلا واسطہ رشتہ رکھتے ہیں۔ مثال ۲

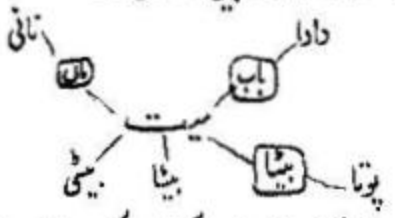

اس صورت میں پوتا۔ دادا اور نانی بواسطہ مورث کے ساتھ رشتہ رکھتے ہیں لیکن بروقت وفات مورث کے وہ واسطہ نہ تھا اس لئے قرآن کی رو سے وہ وارث ہوں گے کیونکہ مورث ان کا اقرب ہے۔ اور بیٹا اور بیٹی جو بلا واسطہ مورث کے رشتہ دار ہیں، نہ پوتے کو محروم کر سکتے ہیں نہ دادا کو نہ نانی کو۔ یہ وراثت کا سلسلہ قائم مقامی کے اصول پر ہے۔ قرآن فرماتا ہے "ولكل جعلنا موالي مما ترك الوالدان والاقربون" جو کچھ والدین اور اقرب چھوڑ مریں اس سب کے ہم نے وارث بنا دئے ہیں۔ لہٰذا اگر قائم مقامی کا اصول نہ رکھا جائے تو ترکہ کی تقسیم رک جاتی ہے۔

مثال

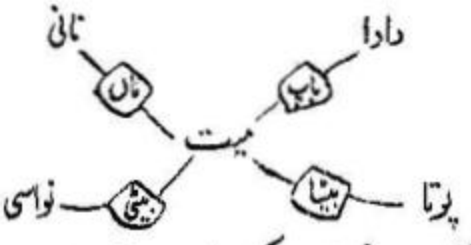

جن کا رشتہ میت کے ساتھ بلا واسطہ تھا وہ سب فوت ہو چکے ہیں۔ اب جو ورثہ موجود ہیں وہ سب بواسطہ رشتہ رکھنے والے ہیں لیکن واسطے بروقت وفات مورث کے مفقود تھے اس لئے مورث ان کا اقرب ہوگا ان کو حصے دیئے جائیں گے قائم مقامی کے اصول پر۔ قائم مقامی کے اصول کا انکار قرآن کا اور عقل و فطرت کا انکار ہے۔

دو اہم گوشے

(۱) اتباعِ سلف اور (۲) اجماعِ امت

یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق سب سے پہلے طلوع اسلام نے آواز اٹھائی تھی اور دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا تھا کہ یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کر دینا ہمارے فقہاء کرام کی ایک غلط فہمی پر مبنی تھا۔ قرآنی آیات وراثت پوتے کو اپنے دادا کے ترکہ سے محروم نہیں کرتیں۔ (حتیٰ کہ تاریخی روایات میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلعم نے یتیم پوتے کو اپنے دادا کے ترکہ سے کبھی محروم کیا ہو) طلوع اسلام کی اس آواز میں خدا نے برکت دی اور پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک ممبر مسٹر چیمہ صاحب کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ انھوں نے اس مسئلہ سے متعلق پنجاب اسمبلی میں ایک بل پیش کر دیا۔ اسوقت سے آجتک مسلسل اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں شور برپا ہے۔ طلوع اسلام کے دلائل کا جواب آج تک کسی سے نہیں بن پڑا۔ جو شخص بھی طلوع اسلام کے اس مسلک کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اس کی بنیادی دلیل صرف یہ ہوتی ہے کہ چودہ سو سال سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں متفق علیہ چلا آرہا ہے۔ تمام ائمہ اور اکابر اس کے قائل چلے آرہے ہیں۔ کیا ان تمام علماء اور اکابرین ملت کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ مسئلہ قرآن کے خلاف ہے کہ آج طلوع اسلام ہی کو سب سے پہلے امت کی اس شدید غلطی کا احساس ہوا مولانا مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی نے تو یہانتک تحریر فرما دیا تھا کہ

> فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں جہانتک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (ترجمان القرآن مارچ ۱۹۵۲ء)

آپ نے لاحظہ فرمایا کہ مودودی صاحب کو باوجود یکہ اس کا اعتراف ہے کہ "مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے" پھر بھی اس پر اصرار ہے کہ "خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ مولانا مودودی نے مارچ ۱۹۵۲ء میں یہ تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک جن حضرات نے بھی اس پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے اسی دلیل پر زور دیا ہے اور اسی کو مختلف الفاظ میں دہرایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ علماء حضرات کی اس "قوی ترین" دلیل کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ دین میں اس دلیل کی کیا حیثیت ہے۔ سب سے پہلے قرآن کریم کو دیکھئے کہ وہ سلف سے خلف تک اسلاف کی کسی متفقہ روش کے خلاف کیا فیصلہ دیتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف طلوع اسلام ہی کے نزدیک بلکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک دین کی بنیاد اولیں قرآن اور صرف قرآن ہی ہو سکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے

قرآن اور اجماع سلف

کہ یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد سلف سے خلف تک متفقہ طور پر ایسا کرتے چلے آرہے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے (یعنی قرآن) اس کی پیروی کرو تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ (ہم قرآن کی پیروی نہیں کرتے) بلکہ ہم تو اس روش کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ چاہے ان کے باپ دادے کسی چیز کی بھی عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ صحیح راہ پائے ہوئے ہوں۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے اس دلیل کو جو ما انزل اللہ (قرآن کریم) کے مقابلہ میں کفار عرب پیش کیا کرتے تھے کن الفاظ میں رد کر دیا ہے کفار عرب بھی یہی کہا کرتے تھے کہ ہمارے اسلاف متفقۃً ایک خاص روش پر چلے آرہے ہیں اور یہ روش سلف سے خلف تک ایسی ہی چلی آرہی ہے۔ کیا ہمارے اسلاف بالکل جاہل تھے اور آج محمد (صلعم) پر خدا کی طرف سے کوئی نیا علم اترا ہے۔ آج بھی جب ما انزل اللہ (قرآن) کی طرف مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی جاتی ہے تو مسلمانوں کا جواب یہی ہوتا ہے۔ دوسری جگہ رسول اللہ صلعم سے خطاب فرمایا گیا ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (مائدہ ۵/۴۹)

اور اے پیغمبر اسلام! تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق ان کے درمیان فیصلے کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے لگ جاؤ۔ ان سے بچتے رہو۔ کہیں وہ ما انزل اللہ (قرآن) کے بعض حصے سے تمہیں (غافل کر کے) کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ اگر وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو تم سمجھ لو کہ خدا کا قانون ان کی بعض خطاؤں کی انہیں سزا دینا چاہتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ کیا (ما انزل اللہ کو چھوڑ کر آباؤ اجداد کے نام پر) وہ جاہلیت کے فیصلے طلب کرنا چاہتے ہیں؟ یقیناً ان لوگوں کیلئے جو علم و یقین کی دولت سے مالا مال ہوں خدا کے قانون سے بہتر فیصلہ دینے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

آیت مذکورۃ الصدر میں قرآن نے بتا دیا کہ بہترین فیصلہ خدا کے قانون (ما انزل اللہ) کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس سے اعراض کرتا اور کنی کاٹنا چاہتے ہیں وہ دراصل جاہلیت کا فیصلہ طلب کرتے ہیں جسے اسلاف کی روش یا سلف سے خلف تک قوم کے متفقہ فیصلہ کے مقدس نقابوں میں چھپا کر وہ اپنے آپ کو اور قوم کو فریب دیتے ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ خدا کی میزان میں ان کی اس دلیل کا کوئی وزن نہیں ہے۔

اتباعِ سلف ان لوگوں کے ہاں

اب یہ دیکھئے کہ جن دو باتوں کو یہ حضرات بطور دلیل پیش کرتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی (۱) اتباعِ سلف اور (۲) اجماعِ امت۔ پہلے اتباعِ سلف کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس بارے میں خود ان لوگوں کی اپنی کیا حالت ہے؟ چونکہ اس باب میں سب سے پیش پیش امیر جماعتِ اسلامی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں اسلئے

ہم انہی کی تحریروں سے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ یہ خود کس حد تک اسلاف کی اتباع کرتے ہیں۔ اسلاف میں سب سے بڑی ہستی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ آپ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کے عقیدہ کو بھی اسلئے آگے بڑھاتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے نام پر عوام سے اپنی اطاعت کرا سکیں ورنہ رسول اللہ صلعم کا کوئی ارشاد یا عمل جہاں ان کی اپنی رائے کے خلاف جاتا ہے وہ نہایت جسارت سے اسے رد کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اصولی طور پر وہ ارشادات و اعمالِ نبوی کے متعلق فیصلہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو بعینہٖ تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حِکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں (تفہیمات، از مودودی صاحب۔ حصہ دوم ص۳۲۷)

اس کی تشریح کرتے ہوئے مودودی صاحب اپنے مضمون نشانِ راہ میں لکھتے ہیں کہ

> مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر شکل میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ ——— تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اسکو ہم بالکل متحجر (FOSCILISE) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانہ کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہو رہا ہے درحقیقت روحِ اسلام سے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقا کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقا کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ (نشانِ راہ ص۵۵)

اطاعتِ رسول

آپ غور کیجئے کہ اس باب میں مودودی صاحب کا مسلک اس مسلک سے ذرا بھی مختلف ہے جسے طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ متبع سنت کہلاتے ہیں اور طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور منکرِ رسالت قرار دیا جاتا ہے۔ مزید برآں تفہیمات جلد اول میں اطاعتِ رسول کی معنوی تشریح کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اسکو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا ذاتی حق حاصل ہے ـــــ اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے جو اصل ایمان ہے اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یکسر مو انحراف کا بھی حق نہیں وہ دراصل نبی بحیثیت انسان کے اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ اس علم، اس ہدایت، اس حکم، اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ صـ ۹۲ ــ ۸۵

اسی طرح رسائل و مسائل میں وہ لکھتے ہیں کہ

دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو جاری کرنے کیلئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کیلئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مزاج اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کیلئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (صـ ۳۱۷ ۔ ۳۱۱)

آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایک تو وہ اصول تھے جنھیں جاری کرنے کے لئے رسول اللہؐ تشریف لائے تھے اور دوسری وہ عملی شکل تھی جن کی رو سے رسول اللہؐ نے ان اصولوں کو عملاً جاری فرمایا۔ وہ اصول تو واجب الاتباع ہیں لیکن ان کی عملی صورتیں جو اس زمانہ کے حالات اور طرز معاشرت کو پیش نظر رکھکر اختیار کی گئی تھیں واجب الاتباع اور غیر متبدل نہیں ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ چیزیں واجب الاتباع نہیں بلکہ مودودی صاحب تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ

اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت ہے اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (رسائل و مسائل صـ ۳۰۸)

سنت رسولؐ کے متعلق آپ نے مودودی کا مسلک مندرجہ بالا اقتباسات میں دیکھ لیا ہے۔ اسی موضوع پر وہ ذرا اور وضاحت سے کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبیؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے، وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے کے لئے اور جاری کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں

اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (ص ۳۱۱-۳۱۰)

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ

شرائع الٰہیہ اس غرض کیلئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کیلئے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جس سے نظام دین میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (ص ۳۱۴)

کہیں آپ دیکھیں گے کہ رسول اللہ کے صریح احکام سے گلو خلاصی حاصل کرنے کیلئے اس قسم کے عذرات بارد پیش کر دیئے گئے ہیں کہ اگر (ڈاڑھی کی) کوئی خاص مقدار بھی ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضورؐ کے مشن کا جزو ہوتا تو آپ ہرگز اس کے تعین میں کوتاہی نہ کرتے مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملہ میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے۔ (ص ۳۱۵)

بلکہ جہاں ان کی رائے رسول اللہ صلعم کے ارشادات سے ٹکراتی ہے وہاں وہ نہایت جسارت اور بے باکی کے ساتھ یہاں تک کہہ دینے سے نہیں چوکتے کہ

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے ..... یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کیلئے ہم مکلف کئے گئے ہیں۔ (بحث رجال رسائل و مسائل ص ۵۵-۵۶)

اگر ارشادات نبویؐ سے گلو خلاصی کی کوئی شکل نہ نکل سکے تو ان حضرات کیلئے یہ بھی دشوار نہیں ہوتا کہ ضعیف اور غیر مستند روایات کی آڑ لے کر (کیونکہ خوش قسمتی سے ان مجموعہ ہائے احادیث میں ہر قسم کی اور ہر مضمون کی احادیث مل جاتی ہیں) مستند اور صحیح روایات کو رد کر دیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ملکیت زمین کے مسئلہ پر ترجمان القرآن میں بحث کا آغاز ہوا اور حکیم حیدر زماں صدیقی مرحوم نے اس موضوع پر کتب صحاح (مثل بخاری و مسلم) کی روایات سے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ صلعم نے زمین کو کرایہ یا بٹائی پر دیکر کاشت کرانے سے صراحۃً منع فرمایا ہے، یہ تمام احادیث سند کے اعتبار سے بالکل صحیح تھیں اور ان کے مقابلہ میں جو حدیثیں پیش کی جاتی تھیں وہ سند کے اعتبار سے نہایت فروتر تھیں مگر چونکہ حکیم صاحب مرحوم کی پیش کردہ صحیح احادیث امیر جماعت اسلامی کے مسلک کے خلاف تھیں تو مودودی صاحب نے نہایت جسارت کے ساتھ یہاں تک لکھ مارا تھا کہ نہیں وہی حدیثیں صحیح ہیں جو میرے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ تمہاری پیش کردہ حدیثیں جو میرے اس مسلک کے خلاف جاتی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں کیونکہ ان کے متعلق میری مزاج شناسیٔ رسول مجھے یہ بتاتی ہے کہ

دراصل نبی صلعم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔ (ملکیت زمین ( )

اس **دراصل** کے ٹکڑے پر غور فرمایئے یعنی ان احادیث کے الفاظ تو بیشک مودودی صاحب کے مسلک کے خلاف جاتے ہیں۔ ان احادیث کی سندات پر بھی کوئی کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہاں **دراصل** ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے تو کچھ اور فرمایا تھا مگر بیان کرنیوالوں نے

روایات میں کسی اور طرح بیان کر دیا۔

یہ ہے ان حضرات کے اتباعِ رسول کی کیفیت جو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت طلوع اسلام کو کوسا کرتے ہیں کہ وہ منکرِ حدیث ہے اور منکرِ رسالت ہے اور رسول اللہؐ کی اطاعت نہیں کرتا۔

صحابہؓ کی اطاعت

اسلاف میں سب سے بڑی شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہو سکتی تھی مگر آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حیثیت اور پوزیشن کو کہاں سے کہاں لا کر خود اپنی ذات کو سندِ آخری (FINAL AUTHORITY) بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ دوسرے اسلاف کے ساتھ ان حضرات کا کیا طرزِ عمل ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ "تا دیگراں چہ رسد" لیکن آپ دیکھتے جائیے کہ جن اسلاف کی دُہائی ہر چار گھڑی دی جاتی ہے ان اسلاف کی یہ حضرات کہاں تک پیروی کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے بعد صحابہ کرام کا مقام آتا ہے۔ صحابہ کرام کے ارشادات کی پیروی کا یہ عالم ہے کہ امیر جماعت اسلامی نے یہ ایک نظریہ پیش کیا کہ جو شخص کسی خاص منصب کا خواہشمند ہو اسے وہ منصب نہیں دیا جانا چاہیے۔ کسی منصب کا خواہشمند ہونا اس کیلئے سب سے بڑی (DISQUALIFICATION) عدم صلاحیت شمار ہوگی۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے خواہشمند اور طلبگار تھے۔ انھوں نے خود کو خلافت کیلئے پیش فرمایا تھا۔ صحابہ اور تابعین نے اس کے باوجود ان کے ہاتھوں پر بیعت کی اور ان کو خلیفہ بنا دیا اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ تم خلافت کے خواہش مند ہو اسلئے تم کو خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا جب ایک صحابیؓ کا عمل موجود ہے کہ وہ سب سے عظیم ترین منصب کا طالب ہوتے ہوئے بھی اس کو حاصل کر لیتا ہے اور تمام موجودہ صحابہ اور تابعین اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے تو آج چھوٹے موٹے مناصب کیلئے اسی چیز کو (DISQUALIFICATION) کیوں قرار دیا جاتا ہے تو اس پر امیر جماعت اسلامی نے واضح الفاظ میں حضرت علیؓ کے اس طرزِ عمل کو رد کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ

> جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس مسئلہ میں امیر جماعت اسلامی قرآن کے حکم اور رسول کے ارشاد کو حضرت علیؓ سے زیادہ سمجھنے کے مدعی ہو رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ عمل کس طرح ان کی غلطی اور خطا قرار پا گیا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحابہ میں جو مرتبہ ہے وہ ظاہر ہے۔ ایک حضرت علیؓ ہی نہیں دوسرے صحابیوں کے ساتھ بھی ان کا یہی عمل ہے کہ وہ جس کے فیصلہ کو چاہتے ہیں نہایت آزادی کے ساتھ رد کر دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب یہ سوال پیش ہوا کہ عورتوں کو ذمہ داری کا کوئی منصب دیا جا سکتا ہے یا نہیں تو امیر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ اسلامی حکومت میں عورتوں کو ذمہ داری کا کوئی منصب نہیں سونپا جا سکتا۔ اس فیصلہ پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے میدانِ جنگ میں باقاعدہ فوج کی کمان فرمائی تھی اور کبار صحابہ نے ان کی کمان میں جنگ فرمائی تھی حتیٰ کہ خود عشرہ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی ان کی کمان میں رہ کر جنگ فرمائی تھی۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو کوئی ذمہ داری کا منصب ہی

نہیں دیا جا سکتا تو امیر جماعت اسلامی نے حضرت عائشہؓ اور دیگر اکابرین صحابہ کے اس عمل کو رد کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اس میں کسی صحابی کا کوئی انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو، ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں مگر اس غرض کے لئے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں۔ نہ اس غرض کیلئے کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک خود ان کی فہم قرآن و سنت اتنی بلند ہے کہ وہ نہایت دلیری سے حضرت عائشہؓ کے اس فعل کو ان کی انفرادی لغزش قرار دے رہے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی وہ واضح ہدایت جو مودودی صاحب کو نظر آ رہی ہے ان حضرات صحابہ کو نظر نہیں آ سکی کہ وہ واضح ہدایت کے موجود ہوتے ہوئے بھی اتنی بڑی لغزش کے مرتکب ہو گئے۔ طلوع اسلام نے جس پر اسلاف کی اہانت کا الزام لگایا جاتا ہے آج تک کبھی بھی اتنی بڑی جسارت نہیں کی کہ ان حضرات صحابہ کو جن کی عمریں رسول اللہ صلعم کے دامن تربیت میں گذری تھیں اس طرح خطاکار اور لغزشیں کرنے والے قرار دیدے۔ طلوع اسلام کا مسلک ایسے تمام مسائل میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس نے ان روایات کی تردید و تکذیب کی ہے جو دامن رسولؐ یا دامن صحابہؓ کو داغدار کرنے والی ہوں اور کبھی ان حضرات کو مطعون قرار نہیں دیا۔ مگر اس کے باوجود یہ حضرات بہت مہذب اور صحابہ کے متبعین مانے جاتے ہیں اور طلوع اسلام کو اسلاف کی تذلیل و تضحیک کرنیوالا قرار دیا جاتا ہے۔

یہ کچھ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ پر ہی موقوف نہیں۔ امیر جماعت اسلامی کے نزدیک تو کم و بیش تمام صحابہ اور تابعین کا یہی حال تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت راشدہ کا عہد کہلاتا ہے جس میں ایک لاکھ کے قریب صحابہ زندہ اور موجود تھے مگر صحابہ کے اس عہد کے متعلق یا بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس عہد کے تمام صحابہ کے متعلق امیر جماعت اسلامی کا فیصلہ یہ ہے کہ

ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں اسلئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دیکر اس خطرہ کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انھوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس (COUNTER - REVOLUTION) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا، ملک عضوض (TYRANT - KINGDOM) نے اسکی جگہ لیلی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زور حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بنکر آئی تھی کھلے دشمن یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث

سے استفہام تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ اور الٹا آپ کو مورد الزام ٹھہرا لیں گے جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی سیاسی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۳ء و جنوری ۱۹۵۴ء)

مندرجہ بالا اقتباس میں آپ نے دیکھا کہ اول تو حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی میں لیکن کامل طور پر حضرت علیؓ کے بعد حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی اور اس جاہلیت کی تین قسمیں تھیں یعنی جاہلیت خالصہ جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ۔ اب اس کے بعد دیکھئے کہ جاہلیت خالصہ نے اسلامی نظام کو کس طرح متاثر کیا۔ مودودی صاحب اس باب میں رقم طراز ہیں۔

جاہلیت خالصہ نے حکومت و دولت پر تسلط جمایا، نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا بادشاہوں کو اللہ کہنے کی جرأت کسی میں باقی نہ تھی اسلئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانہ سے وہی مطلع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو اللہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوئے کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان و عجم کے فلسفے اور آداب و علوم نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی اور اس کی دراندازی سے کلامیات کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پرزے نکالنے لگا اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔

یعنی مودودی صاحب کی اس تحقیق کے مطابق جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جاہلیت خالصہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی نظام پر مسلط ہوئی تو رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ ان کی تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اسلامی بنیادوں پر قائم رہ گیا ہو اور اس نے جاہلیت راہبانہ کے ساتھ مل کر سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دیکر سست کر دیا۔ بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا۔ اسلامی علوم و فنون میں جمود اور رنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا" (صفحہ ۳۷ ایضاً) جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی

جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کے ساتھ جاہلیت مشرکانہ نے پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کیں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام میں نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں (ایضاً ص۳۷) اس کے بعد انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ایک مجدد کا کام یہ ہوگا کہ وہ احیائے نظام اسلامی کرے جس کے معنی ہیں :-

جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحب شریعت نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ (ایضاً ص۴۱)

مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے خیال کے مطابق۔

(۱) عہد صحابہؓ ہی میں زمام قیادت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہوئی تو جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔

(۲) اسی صحابہ اور کبار تابعین کے عہد میں حضرت علیؓ کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی، آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا اور ملک عضوض (TYRANT KINGDOM) نے اس کی جگہ لے لی۔

(۳) یہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آئی تھی اسلئے منافقین ہی نہیں بہت سے اصل مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔

(۴) جاہلیت کی تینوں قسموں یعنی جاہلیت خالصہ، جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ نے متفقہ طور پر اسلامی نظام اجتماعی پر دھاوا بول دیا اور سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دیکر سست کر دیا۔

(۵) اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا ـــــ صرف اتنا ہی نہیں ـــــ بلکہ

(۶) پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کیں اور دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام میں نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں ـــــ تا آنکہ

(۷) ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔

واضح رہے کہ یہ انقلاب معکوس ایک دو دن میں رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ ماہرین اجتماعیات کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں ذہنی تبدیلیوں کے اثرات کم از کم سو سال کے بعد ہی نتائج کی صورت میں مشہود ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ خود مودودی صاحب نے فرمایا ہے اسکی ابتدا خود حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہو چکی تھی مگر اس عہد میں زمام اقتدار کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی؟ تمام کبار صحابہ اور کبار تابعین اس وقت تک موجود تھے اور انہی کے ہاتھوں میں زمام اقتدار تھی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام اقتدار تھی اگر انھوں نے بلا واسطہ اس انقلاب کیلئے زمین ہموار کرنے میں امداد بہم نہیں بھی پہنچائی تب بھی لازمی ہے کہ انھوں نے مداہنت اور بے عملی کا نہایت ہی مایوس کن مظاہرہ کیا ہوگا جو چند ہی دنوں میں حالت اسقدر بگڑ گئی۔ جو ثمرات ہمیں پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں حاصل ہوئے ہیں لازمی ہے کہ ان کا بیج اس سے بہت پہلے بویا جا چکا ہوگا۔ کسی ایک غیر جانب دار آدمی کے سامنے آپ یہ نتائج رکھ دیجئے وہ کبھی بھی پہلی صدی ہجری کے نصف اول کے ارباب حکومت و اقتدار کو ان نتائج کی ذمہ داری سے بری قرار نہیں دے سکے گا۔ خود آپ تھوڑی دیر کیلئے اس امر کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے کہ یہ کس جماعت کی

بات ہو رہی ہے اور پھر خالی الذہن ہو کر جناب مودودی صاحب کے ان ریمارکس کا مطالعہ فرمائیے اور پھر خود ہی بتائیے کہ آپ کے ذہن میں اس پوری صدی کے حضرات کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ امیر جماعت اسلامی کے ذہن میں حضرات صحابہ کرام اور حضرات تابعین کا کیا تصور تھا جس کے ماتحت یہ سطور ان کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئیں۔

امام اعظمؒ کی اتباع

آپ نے دیکھ لیا کہ خود امیر جماعت اسلامی کے ذہن میں حضرات صحابہ اور حضرات تابعین کا کیا تصور ہے اس کے بعد ذرا اس سے نیچے اتریئے اور دیکھئے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے ائمۂ حدیث اور ائمۂ فقہ کے متعلق ان حضرات کا رویہ کیا ہے۔ وہ کہاں تک ان کے اتباع اور پیروی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ انڈو پاکستان برعظیم میں خوش قسمتی سے ان ائمہ فقہ میں سے صرف ایک امام کا مذہب ہی زیادہ تر رائج ہے یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ کا۔ دیگر ائمہ کی فقہیں نہ یہاں رائج ہیں نہ ان کے متعلق کچھ کلام کرنے کی ضرورت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے متعلق آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں (رسائل و مسائل صفحہ ۲۴۴)

اس کے ساتھ ہی اس فقرہ کو بھی ملا لیجئے کہ

> جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسول روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (تفہیمات حصۂ اول صفحہ ۳۲۵)

یعنی ایک طرف یہ اعلان کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں بکثرت ایسے مسائل موجود ہیں جو سنداً ناقابل اعتماد احادیث پر مبنی ہیں یا سنداً قابل اعتماد احادیث کے خلاف ہیں، یا ان میں حدیثیں کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں اور دوسری طرف یہ فیصلہ کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسول روشن ہو جائے اس کیلئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا خواہ وہ کتنے ہی بڑے مرتبہ کا آدمی کیوں نہ ہو حرام ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان بکثرت مسائل میں جن کی نشاندہی انہوں نے فرمائی ہے ان کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرنا حرام ہے۔ اس کے بعد وہ دوسری جگہ مزید صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

> میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کیلئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۲۴۴)

بلکہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ

> اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ کے اور کسی کی نہیں اور رسول اللہ کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

(باقی آئندہ)

امام مہدی کا عقیدہ

اور

مودودی صاحب

طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے یہ بتایا جارہا ہے کہ ظہور مہدی کا عقیدہ غیر قرآنی ہے۔ اس ضمن میں ان روایات کی حقیقت بھی واضح کی گئی ہے جن پر اس عقیدہ کی بنیاد ہے۔ اور واضح دلائل سے بتایا گیا ہے کہ خود نقد احادیث کے اعتبار سے بھی یہ روایات بڑی کمزور ہیں۔ طلوع اسلام کی اس تنقید پر روایات پرست طبقہ کے چاروں اطراف سے سب وشتم کی بوچھار شروع ہوگئی اور اسے منکر حدیث اور کافر کہا گیا۔ لیکن اس طوفان کے چھٹ جانے کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ یہ کہ اور تو اور خود مودودی صاحب بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ روایات بہت کمزور ہیں لہٰذا یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ چنانچہ انھوں نے تحقیقاتی عدالت کے دس نکات کا جواب حال ہی میں دیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ

> مہدی کے ظہور کی نوعیت مسیح کے مسئلہ سے بہت مختلف ہے۔ اس مسئلہ میں دو قسم کی احادیث پائی جاتی تھیں۔ ایک وہ جن میں لفظ مہدی کی تصریح ہے۔ دوسری وہ جن میں صرف ایک ایسے خلیفہ کی خبر دی گئی ہے جو آخری زمانہ میں پیدا ہوگا اور اسلام کو غالب کردیگا۔ ان دونوں قسم کی روایات میں سے کسی ایک کا بھی بہ لحاظ سند یہ پایہ نہیں ہے کہ امام بخاری کے معیار تنقید پر پورا اترے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مجموعۂ حدیث میں کسی کو بھی درج نہیں کیا۔ مسلم نے صرف ایک روایت لی ہے جو لفظ مہدی سے خالی ہے۔ دوسری کتابوں میں جس قدر روایات موجود ہیں ان روایات میں سند سے قطع نظر کرتے ہوئے کمزوری کے متعدد پہلو ہیں۔ (نوائے وقت ۵ رمئی ۱۹۵۴ء)

شکر ہے کہ طلوع اسلام کی تنقیدات کا اتنا اثر تو ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے خود مودودی صاحب امام مہدی کی آمد کے قائل تھے اور ان روایات کو صحیح سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مقالہ "تجدید و احیائے دین" میں لکھا تھا کہ

> مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانہ کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی لیڈر کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارہ میں صاف پیشین گوئیاں نبی صلعم کے کلام میں موجود ہیں۔ (ترجمان القرآن بابتہ دسمبر ۴۰ء وجنوری ۴۱ء صفحہ ۳۲)

غور فرمایا آپ نے، اس وقت ارشاد تھا کہ رسول اللہ صلعم کے کلام میں امام مہدی کے متعلق صاف پیشین گوئیاں موجود ہیں اور اس لئے مودودی صاحب کا عقیدہ تھا کہ "عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ امام مہدی پیدا ہوں" اور اب یہ ارشاد ہے کہ ان پیشین گوئیوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ مندرجہ صدر اقتباس کے حاشیہ میں مودودی صاحب

نے لکھا تھا کہ

اگرچہ یہ پیشین گوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں مگر یہاں اس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے منصب امامت میں نقل کی ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد مودودی صاحب اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

میں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنا یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ (ایضاً)

یعنی اس وقت مودودی صاحب کے نزدیک نہ صرف مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کی بکثرت روایات ہی صحیح اور قوی تھیں بلکہ ظہور مہدی کے متعلق ایک ایسی روایت جس کی سند کے متعلق انھیں شبہ تھا، بھی اس لئے قابل قبول تھی کہ وہ روایت دوسری روایات کے ساتھ مطابقت رکھتی تھی۔

اور آج یہی مودودی صاحب ہیں جو فرماتے ہیں کہ ان کتابوں میں ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں وہ نہ صرف سند کے اعتبار سے ہی کمزور ہیں بلکہ ان میں کمزوری کے متعدد پہلو اور بھی ہیں۔

یہ ہے ایک ایسے مشہور عقیدہ کے متعلق ایک ایسے شخص کا تضاد جسے اس کی جماعت صالحین کا امام مانتی ہے اور جس کے متعلق مشہور یہ کیا جاتا ہے کہ وہ آج عالم اسلام میں سب سے بڑا عالم ہے۔

یہ خود مہدی بن رہے تھے

آپ شاید حیران ہوں کہ آمد مہدی کے متعلق اس وقت ایسے صاف اقرار اور اب اسقدر کھلے ہوئے انکار کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے انھوں نے ۱۹۴۰ء میں عقیدۂ ظہور مہدی کو پیش کرنے کے بعد یہ کہا تھا کہ امام مہدی اس انداز کے نہیں ہوں گے جس انداز کے عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ

میرا اندازہ یہ ہے کہ آنیوالا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ . . . . . وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (SCHOOL OF THOUGHT) پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کریگی مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ جائے گی۔ (ایضاً ص ۴۴-۴۵)

آپ دیکھیں گے کہ اس میں صرف اس قدر لکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہوگا اور وہ آل رسول سے (سید) ہوگا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات تھی جب مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی ہے اور اپنے ہاتھ پر لوگوں سے تجدید ایمان کی بیعت لی ہے۔ اس وقت مہدی کا دعوےٰ کرنے والے کے متعلق مسلمانوں کا طرز عمل فقط یہ تھا کہ یہ اس کے خلاف مناظرے کیا کرتے تھے۔ یہ طرز عمل بہت

معصوم ساتھا لیکن پچھلے سال پنجاب میں مرزائیوں کے خلاف جو کچھ ہوا اس سے انھوں نے محسوس کیا کہ اب مہدی بننا ایسا بے خطر نہیں ہے لہٰذا انھوں نے مہدی کے عقیدہ سے بھی انکار کر دیا اور ان روایات کو بھی ٹھکرا دیا جنھیں وہ اس وقت اس یقین سے پیش کر رہے تھے، یا اسلئے کہ اگر کل کو کسی نے کہدیا کہ انکی نیت خود مہدی بننے کی تھی تو کہدیا جائے کہ صاحب ہیں تو مہدی کے آنے کا قائل ہی نہیں۔

غور کیجئے کہ ان لوگوں کی مذہبی بازی گری کیا کیا کرتب دکھاتی ہے۔

اجماعِ امت

لیکن ایک چیز اور بھی غور طلب ہے۔ مودودی صاحب اپنے اسی بیان میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدہ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری سے آجتک امت کے تمام علماء اور فقہاء اور مفسرین و محدثین کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ مسیح موعود کی بعثت ثانی کی خبر صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں اکابر علماء کے اقوال ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ صرف معتزلہ اور بعض ایسے ہی دوسرے فرقوں کے چند لوگوں نے اس کو ختم نبوت کے منافی سمجھ کر رد کیا ہے۔

یعنی مودودی صاحب عقیدۂ نزول مسیحؑ کی سند یہ بھی مانتے ہیں کہ اس عقیدہ پر پہلی صدی سے آجتک امت کا اتفاق رہا ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کیا عقیدۂ مہدی کے متعلق بھی پہلی صدی سے آجتک امت کا اسی قسم کا اتفاق نہیں چلا آرہا ہے۔ اگر نزول مسیحؑ کے متعلق امت کا اتفاق سند ہو سکتا ہے تو ظہور مہدی کے متعلق اسی قسم کا اتفاق سند کیوں نہیں بن سکتا۔ شاید یہ کہدیا جائے کہ مودودی صاحب نزول مسیح کے متعلق اجماع امت کو بطور سند پیش نہیں کرتے بلکہ بطور تائید پیش کرتے ہیں۔ سند ان کے نزدیک روایات ہی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ مودودی صاحب کے نزدیک صرف اتفاق امت بھی سند ہوتا ہے چنانچہ وہ یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صحیح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا پر قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اسکو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے (ترجمان القرآن مارچ ۱۹۵۲ء)

لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقیدۂ مہدی کے متعلق روایات کمزور ہی سہی لیکن جب اس پر امت کا اتفاق چلا آرہا ہے تو پھر مودودی صاحب اس عقیدہ سے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ وہ مصالح ہیں جنھیں ایک "مزاج شناس رسول" ہی سمجھ سکتا ہے اسی لئے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ جب مصلحت سمجھے تو ایک چیز کو جزو دین بنا دے اور جب تقاضائے مصلحت اس کے خلاف ہو تو اس سے صاف انکار کر دے۔ جسے اس قسم کی جماعت مل جائے جو ان تمام باتوں کے باوجود اسے اپنا امیر مانتی رہے وہ دین سے اس قسم کے کھیل کیوں نہ کھیلے۔

علماء سے سوال

اس ضمن میں ہم تمام غیر احمدی علماء سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ

(۱) اگر عقیدۂ مہدی کی تائید میں روایات اس قدر کمزور ہیں تو وہ گذشتہ پچاس برس سے مرزائیوں سے کس بات پر جھگڑ رہے ہیں، ان سے صاف کیوں نہیں کہدیتے کہ مہدی کے آنے کا عقیدہ ہی غیر اسلامی ہے۔ اور

(۲) اگر اس عقیدہ کا ماننا ضروری ہے تو مودودی صاحب کے متعلق ان کا کیا فیصلہ ہے جو اس عقیدہ سے انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس عقیدہ کے خود قائل تھے۔

واضح رہے کہ جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اس سے پہلے فتویٰ دے چکے ہیں کہ مودودی صاحب منکر حدیث ہیں لیکن ان کی جماعت اسے صاف پی گئی ہے۔

ایک اور انکار مودودی صاحب نے اپنے اس بیان میں جس کا ذکر اوپر آیا ہے اس سوال کے جواب میں کہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت ہوگی یا نہیں کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

اس بات کا جہاں تک ہمیں علم ہے نفیاً یا اثباتاً کوئی احکام نہیں دیئے گئے ہیں نہ اس کی صاف صاف اجازت ہی کا کوئی حکم ہے، نہ اسکی صریح ممانعت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ایک اسلامی ریاست کے اہل حل وعقد اسلام کی عمومی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے متعلق خود ہی مناسب حدود تجویز کر سکتے ہیں۔ (نوائے وقت)

یعنی مودودی صاحب نے یہ کہا ہے کہ اس بارہ میں خدا یا اس کے رسول یا فقہائے امت میں سے کسی کی طرف سے اس کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی حکم نہیں ملتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں اسلامی مملکت کو خود ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس سے پیشتر مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں ایک پورا باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ اسلامی مملکت میں تبلیغ کفر کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ انھوں نے اس باب میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو قطعاً اجازت نہیں کہ

وہ خدا کے دین کے بالمقابل کسی دوسرے دین کی دعوت کو پھیلنے کا موقعہ دیں اسلئے کہ ایسا موقعہ دینے کے معنی لازماً یہ ہیں کہ دین پورے کا پورا اللہ کیلئے نہ ہونے پائے اور کسی غلط نظام زندگی کا فتنہ گر باقی رہ تو وہ اور زیادہ بڑھ جائے۔ آخر وہ خدا کے سامنے گواہی کس چیز کی دینگے۔ کیا اس چیز کی کہ جہاں تو نے حکمرانی کی طاقت بخشی تھی وہاں ہم تیرے دین کے مقابلہ میں ایک فتنہ کو سر اٹھانے کا موقعہ دے آئے ہیں۔ (مرتد کی سزا ص۲۵)

انھوں نے اپنے اس فیصلہ کی تائید میں پہلے قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں اسکے بعد دورِ نبوت دورِ خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ

نبی صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں حکومت کی مستقل پالیسی یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی ہے (ایضاً ص۲۹)

اسکے بعد انھوں نے فقہاء کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک ہمیں نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو آکر اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت دے سکتی ہے جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔ (ایضاً ص۳۰)

آپ نے دیکھ لیا کہ جس مسئلہ کے متعلق ابھی کل تک یہ کہا جا رہا تھا کہ اس میں خدا، اس کے رسول، خلفائے راشدین اور فقہائے امت کا یہ حتمی اور یقینی فیصلہ ہے۔ آج اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اسکی بابت نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم موجود نہیں۔

ہمیں حیرت مودودی صاحب پر نہیں حیرت ان لوگوں پر ہے جو اسکے باوجود ایسے شخص کو اپنا امیر مانتے چلے جاتے ہیں۔

بھولی ہوئی کہانیاں

[ماہوار مجلہ الحمراء کی مئی ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع ہوا ہے جسے انھوں نے علامہ ابن الجوزیؒ کی کتاب "سیرۃ العمرین" سے مرتب کیا تھا۔ اس مضمون میں خلیفہ عمر ابن عبدالعزیزؒ کے بعض کوائف حیات کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ عمر ابن عبدالعزیزؒ نے کوشش کی تھی کہ مملکت میں قرآنی اصولوں کو پھر سے رائج کیا جائے۔ پیش نظر واقعات سے اسکی تائید ہوتی ہے کہ ان کے سامنے قرآن کی روح ضرور تھی۔ طلوع اسلام]

ایک دن عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر متمکن تھے، ایک عیسائی نے جو حمص کا رہنے والا تھا دربار میں آکر یہ شکایت کی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے بیٹے عباس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس کی طرف دیکھا۔ عباس نے کہا "یہ زمین مجھ کو خلیفہ ولید نے بطور جاگیر کے عنایت کی تھی چنانچہ اس کی تحریری سند میرے پاس موجود ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عیسائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "تم کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے کہا "امیر المومنین! میں خدا کی تحریر (قرآن مجید) کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس کی طرف مخاطب ہو کر کہا عباس! خدا کی تحریر تیرے باپ (ولید بن عبدالملک) کی تحریر پر مقدم ہے۔ یہ کہہ کر وہ زمین عباس کے قبضے سے نکال کر عیسائی کو دلا دی۔

ان کا ایک اور کارنامہ جو نہایت قابل قدر ہے، سلاطین بنی امیہ کی ناجائز کارروائیوں کو مٹانا تھا۔ سلاطین بنی امیہ نے ملک کا بڑا حصہ جو زمینداری کی حیثیت سے رعایا کے قبضے میں تھا اپنے خاندان کے ممبروں کو جاگیر میں دیدیا تھا جس طرح سلاطین تیموریہ کے زمانے میں بڑے بڑے صوبے شہزادوں کی جاگیر میں دیدیئے جاتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تخت خلافت پر بیٹھے تو سب سے پہلے ان کو اس کا خیال ہوا لیکن ایسا کرنا تمام خاندان خلافت کو دشمن بنا لینا تھا۔ تاہم انھوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

اول اول جب انھوں نے یہ ارادہ کیا تو تمام خاندان نے ام عمر کو جو عمر بن عبدالعزیزؒ کی پھوپھی تھیں سفیر مقرر کر کے بھیجا انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس جا کر کہا کہ تمام خاندان برہم ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ عام بغاوت نہ ہو جائے اور لوگ ہنگامہ نہ کر دیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں قیامت کے سوا اور کسی دن سے نہیں ڈرتا۔ وہ مایوس ہو کر چلی گئیں

خود عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضے میں بھی اس قسم کی جاگیریں تھیں جو ان کے خاندان کو بنی امیہ کی طرف سے عنایت ہوئی تھیں، عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب ان جاگیروں کا فیصلہ کرنا چاہا تو بڑے بڑے علماء یعنی مکحول، میمون بن مہران اور ابو قلابہ کو بلایا اور کہا کہ ان جاگیروں کی نسبت آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ مکحول نے دب کر جواب دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون کی طرف رخ کیا کہ تم خدا لگتی کہو۔ انھوں نے کہا اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بلا لیجئے۔ وہ آئے تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کیوں عبدالملک! اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا، سب واپس کر دینی چاہئیں ورنہ آپ کا شمار بھی انہی ظالموں اور غاصبوں میں ہوگا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے غلام سے جن کا نام مزاحم تھا اور جن کو ٹالتے تھے، کہا کہ لوگوں نے جو زمینیں ہم کو دیں، نہ وہ اس کے دینے کے مجاز تھے نہ ہم کو ان کے لینے کا حق تھا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ مزاحم نے کہا امیر المومنین! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے بال بچے کتنے ہیں یعنی ان کا گزر کیونکر ہوگا؟ عمر بن عبدالعزیزؒ کے آنسو نکل آئے اور کہا، ان کا خدا مالک ہے ــــ یہ کہہ کر گھر میں چلے گئے۔ مزاحم وہاں سے اٹھ کر عبدالملک (فرزند عمر بن عبدالعزیز) کے پاس گئے اور کہا، بڑا غضب ہوا چاہتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز تمام خاندانی جاگیروں سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ اپنی اولاد کا لحاظ کر لیجئے۔ عبدالملک نے کہا استغفر اللہ تم نے بہت بری رائے دی۔ یہ کہہ کر عبدالملک عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس گئے وہ اس وقت خوابِ راحت میں تھے۔ پہرے والے نے کہا کہ تم لوگ امیر المومنین پر رحم نہیں کرتے دن بھر میں ایک لمحہ تو ان کو آرام لینے دو۔ عبدالملک نے کہا تیری ماں مرے، تو جا کر ان سے کہہ تو سہی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے کانوں میں یہ آواز پڑی، عبدالملک کو اندر بلا لیا اور کہا جانِ پدر! یہ کون ملاقات کا وقت ہے؟ انھوں نے واقعہ بیان کیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں نماز ظہر کے بعد منبر پر چڑھ کر اس کا اعلان کر دونگا عبدالملک نے کہا، اس کا کون ذمہ دار ہے کہ آپ اس وقت تک زندہ رہیں گے۔ غرض اسی وقت عمر بن عبدالعزیزؒ باہر آئے۔ شہر میں منادی کرا دی گئی کہ لوگ مسجد میں جمع ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے منبر پر چڑھ کر کہا، صاحبو! میں ان تمام زمینوں کو جو لوگوں نے ہمارے خاندان کو دی تھیں واپس کرتا ہوں، کیونکہ دینے والوں کو نہ دینے کا حق تھا نہ ہم کو لینے کا۔ یہ کہہ کر جاگیرات کی جو سندیں تھیں صندوق سے نکلوائیں اور قینچی سے کتر کتر کر ان کو پھینکنا شروع کیا ــــ یہ جاگیریں کچھ یمن میں تھیں جن کا نام مکیدس، جبل اورورس تھا۔ کچھ یمامہ میں تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان زمینوں سے دست برداری ظاہر کی۔

بنو امیہ نے یہ غضب کیا تھا کہ باغ فدک کو جس کو حضرت فاطمہ زہراؓ کے تقاضے پر بھی حضرت ابوبکرؓ نے اس بنا پر نہیں دیا کہ وہ مسلمانوں کا حق ہے، اپنا خالصہ بنا لیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خاندانِ رسالت میں منتقل کر دیا۔ خاندان بنو امیہ میں ان کارروائیوں سے سخت برہمی پیدا ہوئی۔ سب نے متفق ہو کر ہشام بن عبدالملک کو عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بھیجا کہ اس فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور قدما جو فیصلہ کر گئے اس کو بحال رکھیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ اگر میرے سامنے ایک فرمان امیر معاویہؓ کا پیش کیا جائے اور ایک عبدالملک کا تو مجھ کو کس پر عمل کرنا چاہیئے؟ ہشام نے کہا، جو مقدم ہو۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا تو خدا کا فرمان (قرآن) سب پر مقدم ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کو تمام خاندان میں ابن سلیمان سے بہت محبت تھی وہ اپنی جاگیر کی سند لیکر آئے کہ میری زمین آپ کیوں چھینتے ہیں؟ فرمایا کہ پہلے یہ زمین کس کے قبضے میں تھی؟ بولے کہ حجاج کے۔ فرمایا، تو یہ حجاج کی اولاد کا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو؟ ابن سلیمان نے کہا، اصل میں یہ زمین عام مسلمانوں کی تھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا تو عام مسلمانوں کو ملنی چاہیئے۔ ابن سلیمان رونے لگے۔ مزاحم نے کہا، امیر المومنین! آپ ابن سلیمان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں۔ فرمایا، ہاں میں ابن سلیمان کو اپنے بیٹے کے برابر چاہتا ہوں، لیکن میں خود اپنے نفس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا ہوں۔

بنو امیہ کے دفترِ اعمال میں سب سے زیادہ قوم کا برباد کرنے والا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے آزادی اور حق گوئی کا استیصال کر دیا تھا۔ عبدالملک نے تخت پر بیٹھ کر حکم دیا تھا کہ کوئی شخص میری کسی بات پر روک ٹوک نہ کرنے پائے اور جو شخص ایسا کرے گا سزا پائے گا۔ اگرچہ اس پر بھی آزادی پسند عرب کی زبانیں بند نہ ہوئیں تاہم بہت کچھ فرق آگیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس بدعت کو بالکل مٹا دیا۔

دو نہایت متدین اور راستباز شخص اس کام پر مقرر کئے کہ عدالت کے وقت ان کے پاس موجود رہیں اور ان سے جو غلطی سرزد ہو، فوراً ٹوک دیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے لوگوں کو عام طور پر جرأت ہو گئی تھی اور لوگ نہایت بے باکی سے ان کے افعال و اقوال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔

آج کل مذہبی جوش اور مذہبی عصبیت کی یہ علامت خیال کی جاتی ہے کہ غیر مذہب کے لوگوں سے نفرت ظاہر کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی تحقیر اور تذلیل کی جائے، یہاں تک کہ اکثر فقہی کتابوں میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کو گھوڑے کی سواری کی اجازت نہ دینی چاہیے۔

لیکن لوگوں کو حیرت ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیزؒ جو مجسمۂ تدین و مذہب تھے ان کا طرزِ عمل ان کے خلاف تھا۔ محدث ابن جوزی نے اسی کتاب میں بہ سند یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ مسلمہ بن عبدالملک جو خاندان بنی امیہ کا دستِ و بازو تھا، اس نے ایک گرجا کے متولیوں کے مقابلے میں دعویٰ دائر کیا۔ فریق مقدمہ جو عیسائی تھے اجلاس میں حسب قاعدہ کھڑے تھے لیکن مسلمہ کو چونکہ خاندانی زعم تھا اسلئے بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، تمہارا فریق مقدمہ کھڑا ہے، اس لئے تم بیٹھ نہیں سکتے۔ تم بھی اس کے برابر کھڑے ہو جاؤ یا کسی اور کو مقرر کر دو جو تمہاری طرف سے مقدمہ کی پیروی کرے۔

مقدمہ کا فیصلہ بھی مسلمہ کے خلاف کیا، یعنی زمین متنازعہ گرجا کے متولیوں کو دلا دی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ اکثر عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں مہمان ہوتے تھے لیکن ان کے کھانے کی قیمت دے دیا کرتے تھے۔ وفات کے وقت اپنے مقبرہ کے لئے جو زمین پسند کی وہ ایک عیسائی کی تھی اس کو بلا کر خریدنا چاہا، اس نے کہا امیر المومنین! قیمت کی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تو یہ امر برکت کا باعث ہوگا لیکن انھوں نے نہ مانا اور تیس دینار دے کر وہ زمین خرید لی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت و سلطنت کا اصلی اصول مساوات اور جمہوریت تھی یعنی یہ کہ تمام لوگ یکساں حقوق رکھتے ہیں اور بادشاہ کو کسی پر کسی قسم کی ترجیح حاصل نہیں۔ صرف ملکی امور میں نہیں بلکہ معاشرت اور ذاتی زندگی میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے کھانے کا یہ طریقہ تھا کہ عام مسلمانوں کے لئے جو لنگرخانہ تھا اس میں ایک درہم (۵ر) روز بھیجا کرتے تھے اور وہیں جا کر عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔

ایک دفعہ رات کے وقت مسجد میں گئے۔ ایک شخص مسجد کے صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ اتفاق سے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاؤں کی ٹھوکر اس کو لگی۔ اس نے جھلا کر کہا، کیا تو پاگل ہے؟ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ نہیں۔ پولیس کے آدمی موجود تھے۔ انھوں نے اس گستاخی کی سزا دینی چاہی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کیوں، اس نے کیا گناہ کیا ہے۔ اس نے تو صرف استفسار کیا تھا کہ کیا تم پاگل ہو؟ میں نے کہہ دیا کہ نہیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے صاحبزادوں میں سے عبدالملک بالکل اپنے باپ کا نمونہ تھے اور اسی بنا پر وہ ان سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ ایک دن عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون بن مہران کو بلا کر کہا کہ میں عبدالملک کو بہت اچھا سمجھتا ہوں لیکن غالباً یہ مہر پدری کا اثر ہے۔ ذرا تم جا کر آزماؤ۔ تمہاری کیا رائے قائم ہوتی ہے۔ وہ عبدالملک کے پاس گئے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ عبدالملک کے غلام نے آ کر کہا کہ میں نے انتظام کر دیا۔ میمون نے پوچھا کیا؟ عبدالملک نے کہا میں نے اس کو حکم دیا تھا کہ حمام میرے نہانے کے لئے خالی کرا دو۔ میمون نے کہا، اللہ اکبر! میرا خیال

تمہاری نسبت بہت اچھا تھا لیکن اب میرے خیال میں فرق آگیا۔ تم کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ حمام کو اپنے لئے خاص کر لو، اور عام لوگوں کو نہانے سے روک دو۔ عبدالملک نے کہا میں نے تمام دن کا کرایہ ادا کر دیا ہے۔ میمون نے کہا تو یہ مشیخت پناہی اور فضول خرچی ہے، تم عام مسلمانوں کے برابر ہو۔ انھوں نے کہا، کیا کروں، لوگ حمام میں ننگے نہاتے ہیں۔ اس لئے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔ میمون نے کہا تو رات کو نہایا کرو۔ عبدالملک نے کہا، آئندہ ایسا ہی کروں گا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ جب مرنے لگے تو مسلمہ بن عبدالملک نے کہا کہ وصیت کر جائیے۔ کہا، میرے پاس کیا ہے جس کی وصیت کروں۔ مسلمہ نے کہا، میں ابھی لاکھ روپے بھیجے دیتا ہوں، جس کو چاہئے اس میں سے وصیت کیجئے۔ فرمایا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ یہ رقم جن لوگوں سے وصول کی ہے، ان کو واپس دیدو۔ مسلمہ یہ سن کر بے اختیار رو پڑے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بیان کرنے کے قابل ہے کہ خلفائے بنو امیہ کی دولتمندی کا یہ حال تھا کہ جب ہشام بن عبدالملک نے وفات پائی تو اس کے ترکہ میں سے صرف اولاد ذکور کو جس قدر نقدی رقم وراثت میں ملی۔ اس کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ تھی، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب وفات پائی تو کل ۱۷ دینار چھوڑے جس میں سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کرنے کے بعد دس دینار بچے، جو ہوئے۔ غرض عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت اور سلطنت ٹھیک اسی اصول کا نمونہ تھی جو اسلام نے قائم کیا تھا اور جس کو سلاطین؛ یہ میں تلاش کرنا بالکل بے فائدہ ہے یہ لوگ درحقیقت خلیفہ نہ تھے بلکہ کسریٰ و قیصر تھے۔

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے!

جون ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ جولائی ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ رجون ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر [illegible] اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ رجون سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ جون میں ختم ہوگا

۷۵۰ — ۷۷۷ — ۹۲۰ — ۹۲۱ — ۹۳۹ — ۹۶۹ — ۹۷۰ — ۹۷۶ — ۹۷۸ — ۹۸۲ — ۹۸۳ — ۹۹۴

۱۰۰۹ — ۱۰۱۴ — ۱۰۲۴ — ۱۲۵۱ — ۱۲۶۱ — ۱۳۵۶ — ۱۵۰۸ — ۱۵۲۶ — ۱۵۲۷ — ۱۵۳۰ — ۱۵۳۱

۱۵۳۲ — ۱۵۳۳ — ۱۵۳۴ — ۱۵۳۵ — ۱۵۴۱ — ۱۵۷۵ — ۱۸۱۷ -

محجوب الارث

[قرآنی قانونِ وراثت کے متعلق علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کے فرمودات قارئینِ طلوع اسلام کی نظروں سے گذرتے رہے ہیں۔ طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت میں بھی دوسرے مقام پران کا ایک تازہ مقالہ شائع کیا جارہا ہے آپنے اس سے پہلے اس موضوع پر ایک اور مقالہ تحریر فرمایا تھا جو لاہور کے ہفتہ وار اخبار چٹان میں شائع ہوا تھا چونکہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس اہم مسئلہ کے متعلق حضرت علامہ کا پورا نقطۂ نگاہ قارئین کے سامنے آجائے اسلئے اس مقالہ کو بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔ چٹان میں شائع شدہ مضمون میں کچھ کتابت کی غلطیاں رہ گئی تھیں جن کی تصیح خود علامۂ ممدوح نے فرمادی ہے۔ طلوع اسلام]

اخبار الاعتصام گوجرانوالہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء میں سید غلام احمد صاحب وکیل منٹگمری نے یتیم پوتوں کے حق وراثت کی مخالفت میں مضمون لکھا ہے جس کی تمام تر بنیاد قاعدۂ الاقرب فالاقرب پر ہے یعنی جو میت سے قریب تر ہو وہ بعید کو محروم کردیتا ہے۔ میں نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں اس قاعدہ یعنی الاقرب فالاقرب پر پوری بحث کی ہے اور ثابت کردیا ہے کہ یہ قاعدہ غلط ہے۔ میرا یہ رسالہ طلوع اسلام اور پھر اخبار چٹان میں چھپ چکا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وکیل صاحب موصوف کی نظر سے نہیں گزرا اور اگر گزرا ہے تو انھوں نے اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا ان کو اور ان کے ہم خیال لوگوں کو پھر ایک بار نہایت اختصار کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱) الاقرب فالاقرب کا قاعدہ نہ اللہ نے بنایا ہے نہ اس کے رسولؐ نے۔ اسکو تو فقہاء نے محض اپنے قیاس سے اختراع کیا ہے جس کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل اور جو خود انھیں کے مسلمات سے جابجا ٹوٹ جاتا ہے۔

(۲) اس قاعدہ کی رو سے وہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کو وراثت سے محجوب گردانتے ہیں مگر بیٹے کی موجودگی میں دادا کو اور باپ کی موجودگی میں نانی کو حصہ دیتے ہیں جب کہا جاتا ہے کہ یہاں کیوں نہیں اس قاعدہ پر عمل کرتے تو کہتے ہیں کہ یہ قاعدہ اصول میں نہیں چلتا فروع میں چلتا ہے لیکن قاعدہ میں تو کوئی خصوصیت نہیں کہ صرف فروع کیلئے ہو لہذا اس کی کوئی دلیل دیجئے تو کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔

(۳) تمہارے یہاں یہ مسلم ہے کہ جو رشتہ قریبہ جدہ بعیدہ کو محروم کرتی ہے پھر تم ہم سے یہ کیسے کہتے ہو کہ یہ قاعدہ اصول میں نہیں چلتا تو کہتے ہیں کہ اصول میں بھی چلتا ہے مگر وحدت قرابت کے ساتھ۔ جب اس کی دلیل پوچھی جاتی ہے تو جواب نہیں دے سکتے۔

(۴) تم بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کو محروم کرتے ہو مگر بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو حصہ دیتے ہو یعنی فروع میں بھی اس قاعدہ کو توڑتے ہو۔

الغرض ایک قاعدہ بنا کر دس جگہ اسکی غلط تاویلیں کرنی پڑتی ہیں اور کہیں مستقیم نہیں ہوتا۔ چنانچہ خود سراجی کی شرح شریفیہ میں سید شریف جرجانی لکھتے ہیں کہ اگر اس قاعدہ کو مطلق رکھو کہ جو اقرب ہو وہ ابعد کو محروم کرے تو باپ کی موجودگی میں نانی کو محروم کرنا پڑے گا اور ــــ گرویکہ اقرب ابعد کو محروم کرے گا جو اس کے ذریعہ سے قرابت رکھتا ہو تو بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کو دینا پڑیگا۔

اب میں مختصراً قرآن کریم سے اس مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں: قرآن نے نسبی متعدد رشتہ داروں میں وراثت کا سب سے پہلا اور بنیادی قاعدہ

یہ بیان کیا ہے للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون . وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیبا مفروضا - (سورۂ نسا رکوع اول) یعنی ماں باپ اور اقرب جو کچھ چھوڑ جائیں خواہ کم ہو یا زیادہ اس میں سے مردوں کو بھی حصہ ملے گا اور عورتوں کو بھی معین حصہ ۔

اس آیت نے مورث بتا دیئے ۔ باپ، ماں اور اقرباء اس سے ورثہ بھی معلوم ہو گئے کہ مرنے والا جس کا باپ ہو یا جس کی ماں ہو یا جس کا اقرب ہو وہ وارث ہوگا یعنی بیٹا ۔ بیٹی ۔ باپ ۔ ماں کے وارث اور اقرب کا وارث وہ جس کے ساتھ مورث کی قرابت بصیغۂ تفضیل ہو ۔ مثال ۱

یہ سب وارث ہوں گے ۔ بیٹا بیٹی اسلئے کہ میت ان کا باپ ہے یا ان کی ماں اور باپ ماں اسلئے کہ میت ان کا اقرب ہے ۔ میں یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑتا کہ خود باپ ماں بھی اقربین میں داخل ہیں کیونکہ اسکی ضرورت یہاں نہیں ہے اس کو میں نے اپنی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں جو عربی زبان میں ہے اور مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے تفصیل کے ساتھ لکھدیا ہے ۔

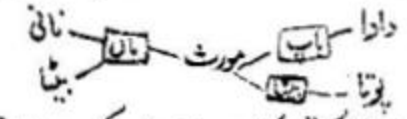

پھر قرآن کہتا ہے ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون باپ ماں اور اقرب جو کچھ چھوڑ مریں اس سب کے ورثہ ہم نے مقرر کر دیئے ہیں ۔ لہذا سلسلۂ تقسیم کا انھیں وارثوں پر ختم نہیں ہو جائے گا ۔ بلکہ ان کی یا ان میں سے کسی کی عدم موجودگی میں وہ قائم مقامی کے اصول پر آگے بڑھے گا ۔ واسطہ کے اٹھ جانے سے مورث ان قائم مقاموں کا اقرب ہوتا جائیگا اور وہ وراثت کے حصہ دار ہوتے جائیں گے ۔ مثال ۲

اس مثال میں مستطیل شکلیں قبروں کی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یہ مورث سے پہلے مر چکے ہیں ۔ ان متوفیان کو جو ترکہ ملنا تھا وہ اب ان کے قائم مقاموں کو دیا جائیگا کیونکہ واسطہ کی عدم موجودگی سے مورث ان کا اقرب ہو گیا ہے موجودہ بیٹا جس طرح دادا اور نانی کو محروم نہیں کر سکتا اسی طرح پوتے کو بھی محروم نہیں کر سکتا ۔ ہاں اگر خود اس بیٹے کے اولاد ہو تو وہ محجوب ہوگی کیونکہ اس کی موجودگی کی وجہ سے مورث ان کا اقرب نہ ہوگا ۔

قرآن کی رو سے وراثت میں اقرب صرف ایک ہے اور وہ مورث ہے ۔ یہاں لغوی بحث نہیں ہے ۔ مورث اقرب ہوگا تو وارث بھی اقرب ہوگا ۔ قرآن نے مورث کو خصوصیت کے ساتھ اقرب قرار دیا ہے ۔ فقیہوں نے اس لفظ کو ورثہ میں استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی الجھن میں پڑ گئے کہ اس سے نکل نہ سکے اور ایک غلط قاعدہ الاقرب فالاقرب بنا ڈالا جس کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں سوائے معصوم یتیموں کو محروم کرنے کے ۔ وکیل صاحب یا ان کے ہم خیال قرآن سے اس مسئلہ کو سمجھنا چاہیں تو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کیونکہ پوتے کی وراثت براہ راست قرآن سے ثابت ہے ۔ اس میں ان کو جو خلجان پڑے وہ دفع کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی تحریر سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلف کا تعصب لیکر ان کی حمایت کیلئے اٹھے ہیں نہ حقیقت کی جستجو کیلئے ۔ مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن جب عدالت قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ زندہ گاڑی ہوئی بچیوں کو سوال کریگا "واذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" تو ان معصوم یتیموں سے بھی جن کو فقہا اپنی ناسمجھی سے تمام خاندانی حقوق اور حیثیت سے بلا گناہ محروم کرتے ہیں ضرور پوچھے گا کہ بای ذنب حجبتم تم کس جرم میں محروم کئے گئے تھے ۔

وکیل صاحب موصوف نے قائم مقامی کے بدیہی اور فطرتی اصول سے بھی انکار کیا ہے حالانکہ پوتے کے معنی ہی ہیں بیٹے کا بیٹا ۔ اور دادا کے معنی ہیں باپ کا باپ جس واسطہ سے رشتہ ہے اسی واسطہ سے قائم مقامی ہے ۔ اس کا انکار حقیقت کا انکار ہے ۔ دیکھیے بھائی اور بہن تین قسم کے ہوتے ہیں ۔ حقیقی ۔ علاتی اور اخیافی یہ تفریق واسطہ اور قائم مقامی کے اصول پر ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کے حقوق الگ ہیں اور مدارج الگ ہیں ۔ وکیل صاحب نے جو دلیل اس کی بیان کی ہے اور دو جگہ بیان کی ہے وہ اور بھی عجیب ہے وہ لکھتے ہیں کہ پوتے کو بیٹے کی قائم مقامی کی وجہ سے حصہ دیا جائے تو بیٹے کی بیوہ کو بھی حصہ دینا چاہیے ۔ حالانکہ قائم مقامی کا اصول نسبی رشتہ داروں میں ہے ۔ متوفی بیٹے کی بیوہ مورث سے نسبی تعلق نہیں رکھتی ہے اس کی وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس وقت چونکہ اس مسئلہ کی بحث چھڑی ہوئی ہے اور بحمد اللہ میں ابھی تک زندہ ہوں اسلئے اس بارے میں ہر شک و شبہ کا ازالہ کرنے اور اس کے ہر گوشہ کو سمجھانے کیلئے تیار ہوں حسبتہً للہ دفاعاً عن الیتامیٰ واتباعاً للقرآن ۔

نقد و نظر

(۱) IQBAL'S MIND AND THOUGHT

یہ چھوٹی سی کتاب ڈاکٹر ایچ ایچ بلگرامی کے ان مختصر لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے لندن آکسفورڈ اور کیمبرج میں گذشتہ پانچ سال میں مختلف تقریبات پر دیئے۔ پہلا لیکچر "شیخ محمد اقبال" کی شخصیت کے تعارف پر مبنی ہے۔ دوسرے لیکچر کا عنوان ہے "اسلامی ثقافت کی روح اقبال کی نظر میں"۔ تیسرے لیکچر کا عنوان ہے "اقبال کا نظریۂ علم اور اس کی شاعری میں اس نظریہ کی اہمیت" چوتھا لیکچر "اقبال کا فلسفۂ عمل" پر ہے۔ پانچواں "اقبال کے تصور جمہوریت" پر اور چھٹا لیکچر ہے "فکر اقبال کے مآخذ" پر۔ ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے ان چھوٹے چھوٹے لیکچروں میں تھوڑے تھوڑے الفاظ میں ان موضوعات پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس اختصار کا نقص یہ ہے کہ پڑھنے والا ہر مقام پر تشنہ رہ جاتا ہے۔ ہماری نگاہ میں جو چیز سب سے پہلے کھٹکی ہے وہ کتاب کا پہلا فقرہ ہے جس میں اقبال کو مشرق کا صوفی شاعر بتایا گیا ہے۔ اقبال بیچارہ ساری عمر چلاتا رہا کہ وہ شاعر نہیں اور عمر بھر وہ یہ بتاتا رہا کہ صوفی نے انسانیت کے کتنے سفینے ڈبوئے ہیں۔ اسی اقبال کو دنیا کے سامنے شاعر اور صوفی کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے! لیکن اس میں ڈاکٹر بلگرامی صاحب کا کیا قصور، سنا ہے کہ کلام اقبال کے شارح یوسف سلیم چشتی صاحب نے انہیں ابن عربی کے نظریۂ وحدت وجود کا سب سے بڑا مبلغ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اقبال سراج الدین پال صاحب کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "جہانتک مجھے علم ہے محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں"۔ باقی رہی تصوف کی شاعری (یعنی صوفی شاعروں کا کمال) تو وہ اپنے اسی خط میں لکھتے ہیں کہ

> تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردہ میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (اقبال نامہ جلد اول ص۵۴-۵۵)

تصوف کے متعلق وہ اپنے مجموعۂ خطوط میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

> اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (ص ۲۸)

اس کے باوجود اقبال کو صوفی شاعر بتایا جاتا ہے اور ان کے کلام کے شارح انہیں ابن عربی کے نظریۂ وحدت وجود کا مبلغ ثابت کرتے ہیں۔ مسئلہ وجود کے متعلق وہ اپنے مذکورہ بالا خط میں لکھتے ہیں کہ "یہ مسلمانوں میں برہمنیت کے اثرات کا نتیجہ ہے"۔ (ص۴۸)

زیر تبصرہ کتاب (ORIENTALIA LAHORE) نے چھاپی ہے چھوٹے سائز کے ایک سو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت چار روپیہ دو آنے ہے جو ہمارے نزدیک بہت زیادہ ہے۔

(۲) مارکس ازم اور اسلام (بزبان انگریزی)

یہ کتاب مظہر الدین صدیقی صاحب کی تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ہے اور (ORIENTALIA LAHORE) ہی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ متوسط سائز کے ایک سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت اس کی سات روپے آٹھ آنے ہے۔

مارکس ازم اور اسلام ہمارے دور کا احمریں موضوع ہے اور نوجوان طبقہ کیلئے بڑا جاذب۔ جب اس کا تقابل اسلام کے ساتھ کیا جائے تو عنوان اور بھی زیادہ وجہ کشش بن جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب کے ایک سو سولہ صفحات تو مارکس ازم کی نذر ہیں۔ اس کے بعد دس صفحوں میں مارکس ازم اور اسلام کے مشترکہ نکات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک باب میں اسلامی آئیڈیالوجی کی اخلاقی بنیاد سے بحث کی گئی ہے اور آخر کے بیس صفحات میں اسلام کا معاشی نظام پیش کیا گیا ہے۔ اور یہی باب جو عنوان کے اعتبار سے سب سے اہم ہے مایوس کن بھی ہے۔ دنیا کے سامنے سوال یہ ہے کہ انسان کی معاشی مشکلات کا حل کیا ہے۔ اسلام کے متعلق ہم دعوے یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے اور تمام انسانی مشکلات کا واحد اور مکمل حل ہے لیکن جب ہم اس کے حل کو پیش کرتے ہیں تو وہ ایک مبہم گفتگو سے زیادہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ آج کل عام طور پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔ نوجوان بیچارہ جو چاہتا ہے کہ وہ مسلمان بھی رہے، لپک کر ان آوازوں کی طرف جاتا ہے اور بعض اوقات مایوس اور اکثر اوقات اسلام کی طرف سے باغیانہ جذبات لیکر واپس آتا ہے۔ اس کا جو نتیجہ ہے وہ ظاہر ہے۔ ہم اپنی ان مقدس کوششوں سے اپنے آپ کو ایک جھوٹا اطمینان دے لیتے ہیں اور مارکس کے حامی آگے بڑھتے چلے جاتے اور اپنی تخریبی کارروائیوں میں تیز سے تیز تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۳) عالمی اعداد و شمار

شائع کردہ مرکز اطلاعات اقوام متحدہ پوسٹ بکس ۵۰۴۶ کراچی ۲ قیمت چودہ آنے صفحات چوراسی۔

اقوام متحدہ اپنے سالنامہ اعداد و شمار وغیرہ میں بڑی مفید معلومات مہیا کر دیتی ہے اور ان کی یہ کوشش اسلامی ممالک کیلئے بالخصوص بڑی کارآمد ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ہاں کبھی اعداد و شمار ہی نہیں رکھے جس قوم نے اپنے حساب کتاب کو قیامت پر اٹھا رکھا ہو وہ اپنے اعداد و شمار کیوں رکھے۔ اقوام متحدہ کے یہ سالنامے کافی ضخیم ہوتے ہیں اور عوام کی دسترس سے باہر۔ کراچی کے مرکز اطلاعات نے ان سالناموں سے ضروری معلومات کو اخذ کر کے اس چھوٹے سے پمفلٹ میں عام فہم زبان میں پیش کر دیا ہے۔ اس پمفلٹ میں البتہ سوویٹ روس کے متعلق معلومات نہیں دی گئیں غالباً اسلئے کہ روس اپنے ملک کے متعلق مستند اطلاعات باہر جانے نہیں دیتا۔

(۴) اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید

یہ اٹھائیس صفحے کا چھوٹا سا پمفلٹ ایکیفے (اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید) کے تعارف کیلئے لکھا گیا ہے اور اقوام متحدہ کے مرکز اطلاعات کراچی ہی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ پمفلٹ تو اتنا مفید نہیں البتہ اگر ایکیفے کی کسی رپورٹ پر مشتمل معلومات کو اسی طرح شائع کیا گیا تو وہ کارآمد چیز ہوگی۔ اس پمفلٹ کی قیمت آٹھ آنے ہے جو زیادہ ہے۔

وہی ہے وہی فضل الحق

طفلک بہ پیری، فضل الحق صاحب آجکل جو کچھ کر رہے ہیں، بہت سے لوگوں کو اس پر تعجب ہو رہا ہے کہ اتنا بڑا تجربہ کار، ایسی ذمہ دار پوزیشن پر فائز اور اس سن و سال میں اس قسم کی مضحکہ انگیز اور افسوسناک حرکات، چہ معنی دارد؟ لیکن جن حضرات کے سامنے ان کے ماضی کے کارنامے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا یہ طفلانہ پن کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بڑے جذباتی انسان ہیں اور جب شدت جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں تو پھر انہیں کچھ یاد نہیں رہتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ اس طبیعت کے انسان پر جب بڑھاپا آ جائے تو وہ سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہو جاتا ہے۔ ابھی تو ان کی ان حرکتوں کی ابتدا ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

۱۹۴۱ء میں جبکہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے ملی نصب العین، یعنی حصول پاکستان کا اعلان کر دیا تھا، یہ تحریک بڑی کشمکش کے دور سے گذر رہی تھی، اس زمانہ میں پنجاب میں سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم تھے اور بنگال میں یہی فضل الحق صاحب تھے۔ اول الذکر نے اپنی شاطرانہ روباہ بازیوں سے اور ثانی الذکر نے اپنی طفلانہ مضحکہ انگیزیوں سے بیچارے قائد اعظم (مرحوم) کو جس قدر تنگ کر رکھا تھا اس کی یاد کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ ایک دفعہ کیا ہوا، اس کا ذکر طلوعِ اسلام کے الفاظ میں سن لیجئے جو اس نے اپنی اشاعت بابت ماہ جون ۱۹۴۱ء کے لمعات میں لکھے تھے۔ لمعات کا یہ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

لیگ کے نام لیواؤں میں دو وزیر اعظم ہیں، ایک "دانا دشمن"[1] دوسرے "نادان دوست"[2]۔ "ضعیف و ناتواں ناخدائے کشتی ملت"[3] ادھر ادھر کے منتشر تختے اکٹھے کر کے، "ناؤ تو نہیں" ناؤ کا ڈھانچہ" تیار کرتا ہے کہ کبھی ایک کے مصالح و مقاصد کی سطح آب کے نیچے چھپی ہوئی چٹانیں اسے پاش پاش کر دیتی ہیں اور کہیں دوسرے کا سیلاب جذبات اس کا رخ ساحل سے دوسری طرف پھیر دیتا ہے ناؤ کا کھویا کبھی ایک سے حفاظت کی تجاویز سوچتا ہے، کبھی دوسرے کے طوفانِ جذبات کو آئین و ضوابط کے سواحل میں محصور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر منتشر تختوں کو یکجا کرنے میں لگ جاتا ہے اور پھر اس کا رخ جانب منزل متعین کر دیتا ہے۔ کشتی میں بیٹھنے والوں کی بالعموم یہ کیفیت ہے کہ اس کش مکش کو "ناخدا اور اس کی کشتی" کا مسئلہ سمجھ کر اپنی اپنی تفریحات میں مگن ہیں۔ حوادث زمانہ کی طغیانیاں چاروں طرف سے ہجوم کر کے آ رہی ہیں۔ آفات سیاسیہ کی ہنگامہ خیزیاں یورش کر رہی ہیں۔ مخالفوں کے جھکڑ چل رہے ہیں مخاصمت کی آندھیاں اٹھ رہی ہیں۔ اور اس اژدحام مشکلات میں وہ ضعیف و ناتواں ملاح ساحل کی طرف نظر جمائے ان تمام مشکلات در مشکلات سے بیگانہ وار محض اللہ کے فضل و کرم کے بھروسے پر کشتی کو کھینچتا چلا جا رہا ہے۔ آسمان اس منظر پر متحیر ہے۔ زمین متاسف ہے لیکن کشتی کے مسافر بالعموم نہ اس سے متاثر ہیں نہ متاسف۔ سینہ آب نے ایسی کشتی اور چشم فلک نے ایسا کشتی بان کم دیکھا ہوگا۔

---

[1] سر سکندر حیات خاں مرحوم۔ [2] فضل الحق صاحب۔ [3] قائد اعظم مرحوم۔

مدراس کے ریزولیوشن[1] نے خدا خدا کر کے پنجاب کی مخالفت کا منہ بند کیا تھا کہ بنگال کے وزیر اعظم مون سون (MON-SOON) کے شور انگیز طوفان میں اڑتے ہوئے، کلکتہ سے شملہ جا پہنچے۔ ملک کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کیلئے جناب وائسرائے کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی۔ حساس حلقوں میں اس سے ایک اضطراب پیدا ہوا اور اس تحریک کا پہلا مظاہرہ کلکتہ کی مسلم لیگ کی طرف سے ہوا جس نے بنگال کے وزیر اعظم اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر (جناب فضل الحق صاحب) کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کا ریزولیوشن پاس کر کے شائع کر دیا۔ جذباتی انسان پر اس کا جو اثر ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ جناب فضل الحق صاحب نے اس کے خلاف غم و غصہ سے چھلکتا ہوا ایک بیان دے مارا لیکن اس کے بعد جب جذبات کی آندھیاں فرو ہوئیں تو کچھ دوسرے بیان میں اعتدال پر آ گئے۔ یہ واقعہ کئی ایک اعتبار سے افسوسناک بھی اور الم خیز بھی، ہم نے نم آلود آنکھوں سے اسے پڑھا اور اب کلیجہ پر پتھر رکھ کر اس کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ اس کا تذکرہ کئے بغیر چارہ نہ تھا۔

جناب فضل الحق صاحب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں لیکن ہماری شوریدہ بختی کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے اور ان کے سیلاب میں آئین و ضوابط کی نگہداشت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اتنی بڑی ذمہ دار شخصیت کیلئے یہ بڑا نقص ہے، اور ان کا یہی نقص بعض اوقات اس قسم کے افسوسناک واقعات کا موجب بن جاتا ہے جو ہماری سیاسی فضا میں کچھ وقت کیلئے وجہ دلگرفتگی ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جو سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں کونسا حساس قلب ہے جو انہیں دور کرنے کیلئے مضطرب نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھیں کہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ان کا جلد از جلد سلجھانا نہایت ضروری ہے۔ ان حالات کے ماتحت جناب فضل الحق صاحب جیسے جذباتی انسان کا ہمہ تن اضطراب ہو جانا کچھ خلاف توقع نہیں، لیکن جذبات کی اس رو میں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ اس کشمکش میں مسلمانان ہند کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت اور ان کے احساسات و مقتضیات کی ترجمانی کا حق ایک اور صرف ایک شخصیت کو حاصل ہے۔ وہ شخصیت جسے مسلمانوں نے اپنی وکالت و نیابت کیلئے منتخب کیا ہے اور وہ اس اہم ترین فریضہ کی سرانجام دہی کی پوری اہلیت و احساس رکھتا ہے ہم اس سے پیشتر کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں کہ مسلمان جب ملت سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کی انفرادی حیثیت (PERSONAL CAPACITY) کوئی شے نہیں رہتی اس کی حیثیت ایک قطرہ کی سی ہے جو سمندر میں جا ملا۔ اب سارے سمندر کا ابھرنا اس کا ابھرنا ہے اور اس کا گرنا اس کا گرنا ہے۔ اسلئے یہ اصول اسلامی نقطۂ خیال سے یکسر غلط ہے کہ فلاں بات میں نے اپنی ذاتی حیثیت سے کی فلاں بحیثیت وزیر اعظم اور فلاں باعتبار رکن مسلم لیگ۔ مسلمان کی صرف ایک حیثیت ہے یعنی مسلمان! خدا کا غلام اور ملت کا جزو لاینفک۔ اس کے علاوہ کسی اور حیثیت کا خیال انانیت ہے اور جرم عظیم۔ اگر کوئی سپاہی ہے تو بھی ملت کے ایک پرزہ کی حیثیت سے ہے۔ وزیر اعظم ہے تو بھی جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے! ملت سے الگ کسی اور حیثیت میں وزارت عظمیٰ چھوڑ شہنشاہیت بھی ملتی ہو تو اس کا قبول کرنا حرام ہے۔ پھر جب ملت نے اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر منتخب کر لیا تو ملت کی نمائندگی کا صرف اسی کو حق پہنچتا ہے۔ اس کی آواز سے اپنی آواز

---

[1] اس میں نظریہ پاکستان کی وضاحت کی گئی تھی۔

بلند کرنا کس طرح روا رکھا جا سکتا ہے۔ مجلس مشاورت میں اس کی مخالفت کیجئے۔ اس سے بحث کیجئے۔ اپنی کہئے، اس کی سنئے، اس کی رائے کی تائید کیجئے، تردید کیجئے۔ ہر قسم کا حق آپ کو حاصل ہے لیکن جب ایک معاملہ طے ہو جائے تو اس کے بعد آپ کا فریضہ اطاعت اور کامل اطاعت ہو اور اسی طرح جب کسی جگہ ملت کی نمائندگی کا سوال پیش ہو تو وہاں آپکی حیثیت کوئی ہستی نہیں رکھتی، وہاں آپ کے افیس اور فقط اس امیر کو بولنے کا حق حاصل ہے تا آنکہ وہ آپ کو کسی خاص مقصد کیلئے مامور نہ کر دے۔ یہ ہے جماعتی زندگی کی اصل۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر بہبود ملت کی تمام عمارت قائم ہوگی۔ اس لئے اگر جناب فضل الحق صاحب کے ذہن میں کوئی ایسی تجویز آئی تھی جو ان کے نزدیک موجودہ سیاسی تعطل یا کشمکش کا حل پیش کر سکتی تھی تو انھیں چاہئے تھا کہ اس تجویز کو اپنی جماعت اور اس کے امیر کے سامنے پیش کرتے اور وہاں کا فیصلہ نائب ملت کی طرف سے دوسروں کے سامنے جاتا۔ یہ تھی راہ صواب۔ ہم جناب فضل الحق صاحب کی خدمت میں اس احترام و عقیدت کے ساتھ جو ان کی خوبیوں کی بنا پر ہمارے دل میں موجود ہے با ادب گذارش کریں گے کہ وہ ان معروضات پر اپنے قلب و دماغ کے پورے توازن کے ساتھ غور فرمائیں اور اگر ان سے متفق ہوں تو آئندہ کیلئے ایسے اقدام سے احتیاط برتا کریں جو ایک طرف ملت کی صفوں میں انتشار و خلفشار کا موجب بن جائے۔ دوسری طرف اغیار کو طعنہ زنی اور تبسم زیر لبی کا موقع دے۔ وہ یقین مانیں کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کے خلوص کی بڑی قیمت ہے۔ وہ ایسی گراں بہا متاع کو حفظ آئین کے حصار حصین میں محفوظ رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کی یہ قدر و منزلت نہ ان کی وزارت عظمیٰ کی وجہ سے ہے نہ کسی اور حیثیت سے۔ یہ فقط اسلئے ہے کہ وہ ان کی نمائندہ جماعت کے ایک محکم رکن ہیں اور امیر ملت کے وفا شعار سپاہی۔ اگر وہ اپنی اس حیثیت کو الگ کر لیں تو پھر سندھ۔ سرحد۔ پنجاب اور بنگال یکساں ہیں۔ مسلمان کے نزدیک قدر و قیمت متعین کرنے کی ایک ہی میزان ہے اور وہ ہے **تمسک بالجماعت** جو اس میزان میں پورا اترتا ہے ان کی آنکھوں کا تارا ہے جو نہیں اترتا آشوب چشم ہے۔

یہ تو جون ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ تین چار ماہ بعد انھوں نے پھر ایک حرکت کی جو پہلی سے بھی زیادہ تعجب انگیز اور افسوسناک تھی۔ اس کی تفصیل بھی طلوع اسلام کے سابقہ نقش سنئے۔ اس نے اپنی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء میں حسب ذیل لمعات لکھے تھے۔

دنیا میں عقل کی تو ایک حد ہوتی ہے لیکن بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی یعنی کوئی نہ کوئی ایسا مقام آ سکتا ہے جہاں پہنچکر آپ کہدیں کہ اس سے آگے معاملہ حد عقل سے ماوراء ہے لیکن آپ کہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بے عقلی کی حد ہے۔ آپ جس حد کا بھی تعین کریں گے کوئی نہ کوئی ایسا نکل آئیگا جس کی بوالعجبیاں آپ کی اس حدود بندی کو چیلنج دیدیں۔ چنانچہ اس میدان میں حدود فراموشی کا یہ نیا ریکارڈ ہمارے اس بھائی کی طرف سے قائم ہوا ہے جسے ہم ایک عرصہ سے "نادان دوست" کہتے چلے آ رہے تھے دنیا میں قومیں اسوقت پنپتی ہیں جب ان کے ارباب حل و عقد کی جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہو جن کے سینے میں پر خلوص دل اور سر میں فراست آمیز دماغ ہو۔ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر جہاں تدبر و فراست ہے وہاں خلوص و ایقان نہیں اور جہاں خلوص و ایمان ہے وہاں تدبر و فراست نہیں۔ نتیجہ یہ کہ کبھی اول الذکر گروہ کی منافقانہ روباہ بازیوں کا رونا قوم کے سامنے ہوتا ہے اور کبھی

ثانی الذکر کی ناعاقبت اندیشیوں کا ماتم بجائے اس کے کہ قوم اپنی صلاحیتوں اور استعداد کو کسی تعمیری کام میں صرف کرے اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہتی ہے اور کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک چلنے کے باوجود رہتی وہیں کی وہیں ہے۔ گذشتہ ماہ ڈیفنس کونسل سے قطع علائق کا مسئلہ بیم ورجا کے موج در موج مراحل سے گزر کر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی گودی میں جا کر تھما تشویش آگیں قلوب کو کچھ سکون ہوا کہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

لیکن اس کے بعد ہمارے بھائی جناب فضل الحق صاحب کی طرف سے جس جنون آمیز شورش کا طوفان اٹھا وہ سکون و قرار کو خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ ہمیں جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے جناب فضل الحق صاحب کے خلوص میں کچھ شبہ نہیں ہوا لیکن مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کی ناعاقبت اندیشی اور عدم تدبر اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ وہ قوم کیلئے ایک انوکھی مصیبت کا سامان پیدا کر دیتا ہے ناعاقبت اندیش انسان بالعموم مغلوب الغضب اور سریع الغیظ ہوتا ہے۔ ذرا سی مخالفت اس کے خون کو کھولا دینے کیلئے کافی ہوتی ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے بعد اسے بالکل ہوش نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مشتعل جذبات کا سیلاب تھمتا ہے تو وہ حسرت آمیز نگاہوں سے اپنی عقل و خرد کی کشتی کے ٹوٹے تختوں کو دیکھتا ہے اور اپنے کئے پر پشیمان ہوتا ہے۔ ایسے افراد کیلئے امن و سلامتی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ راہ ہے امیر ملت کی اطاعت بے غل و غش اطاعت، بلا چون و چرا اطاعت۔ خلوص جب اطاعت کے قالب میں ڈھل جائے تو ایک ایسی جوہر دار شمشیر میں منتقل ہو جاتا ہے جس کی کاٹ بے پناہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ اطاعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے تو عدم تدبر کے باعث ایک ایسی مصیبت بن جاتا ہے جس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جناب فضل الحق صاحب کا عدم تدبر اسوقت تک نبھتا چلا جا رہا تھا کہ وہ اپنے خلوص کو امیر ملت کی اطاعت میں محصور کرتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی پچھلے دنوں جب انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کی غرض سے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کے ایک اجتماع کی اسکیم سوچی تھی تو اس پر جناب جناح نے تنبیہ کی۔ اس تنبیہ کے جواب میں جناب فضل الحق صاحب نے بلا تکلف و تامل اعلان کیا تھا کہ میرا شیوہ اطاعت ہے۔ میں اپنے قائد اعظم سے بالا بالا کوئی قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا (یہ خط و کتابت اخبارات میں شائع ہو چکی ہے) جناب فضل الحق کی روش بڑی مستحسن تھی اور درخور ہزار تبریک و تہنیت۔ اور یہ اتنا بڑا جوہر تھا کہ ان کے عدم تدبر کے سقم کو اپنی چادر سے ڈھانپے چلا جا رہا تھا۔ لیکن افسوس کہ ڈیفنس کونسل کے مسئلہ میں ان کے مشتعل جذبات ان کے جذبۂ اطاعت پر غالب آگئے۔ اور وہ ایک جوہر جو ان کی قدر و قیمت کا باعث تھا یوں تباہ ہو گیا۔ ذرا غور فرمایئے کہ انسان مغلوب الغضب ہو کر کیا کچھ کر بیٹھتا ہے۔ غور فرمایئے اور اس سے عبرت پکڑیئے انھوں نے

(۱) ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دیا تاکہ ملت میں انتشار نہ پیدا ہو اور ساتھ ہی

(۲) مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے استعفیٰ دیدیا کہ ملت میں انتشار پیدا ہو جائے۔ پھر

(۳) لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے الگ ہو گئے کیونکہ انھیں لیگ کے ارباب حل و عقد کے خلاف بالعموم اور صدر مسلم لیگ کے خلاف بالخصوص مبینہ شکایات ہیں۔ لیکن

(۴) مسلم لیگ کے باقاعدہ ممبر اور بنگال پراونشل لیگ کے حسب سابق صدر باقی ہیں۔

(۵) وہ مجلس عاملہ اور کونسل کے ممبر تھے ہی۔ اس وجہ سے کہ وہ بنگال پراونشل لیگ کے صدر ہیں۔ اسلئے اگر وہ مجلسِ عاملہ اور کونسل سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے تو انھیں اپنی صدارت سے مستعفی ہونا چاہئے تھا۔ پھر

(۶) انھوں نے بار بار اعلان کیا کہ بنگال کی لیگ قاطبۃً ان کے ساتھ ہے۔ حالانکہ

(۷) بنگال کی لیگ نے کھلے بندوں ان کی اس روش کے خلاف واضح الفاظ میں ریزولیوشن پاس کردیا۔ اور اس پر بھی

(۸) وہ بنگال کی مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی نہ ہوئے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد

(۹) قوم کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ گھبرائیے نہیں میں ۲۶ر اکتوبر کو کونسل کے اجلاس میں اپنی پوزیشن واضح کروں گا۔ حالانکہ

(۱۰) پوزیشن واضح کرنے کا مقام مجلس عاملہ کا اجلاس بھی تھا اور اب تو وہ خود کونسل سے استعفیٰ دے چکے ہیں تو پھر اس میں پوزیشن کس حیثیت سے واضح کریں گے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک اطاعت کے جذبہ کو چھوڑ کر انھوں نے کس طرح اپنا مرکزِ ثقل کھویا ہے کہ طوفان میں بہنے والے کی طرح کہیں پاؤں نہیں جمتا اور بے ربط ہاتھ پاؤں مارے چلے جا رہے ہیں۔

اس باب میں جناب فضل الحق صاحب کی ناعاقبت اندیشی کا سب سے زیادہ افسوسناک مظاہرہ وہ چٹھی ہے جو انھوں نے اپنے استعفیٰ کے ضمن میں سکریٹری مسلم لیگ کو لکھی اور اخبارات میں شائع کرائی ہے۔ ہم اس چٹھی کے ان بے بنیاد الزامات و شکایات کو تبصرہ کا مستحق نہیں سمجھتے جو انھوں نے جوشِ غضب میں پوری جماعت اور اس کے مرکز کے خلاف عائد کئے ہیں۔ البتہ اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے متعلق ہم بصد کرب و الم چند آنسو بہا لینے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے اس اختلافی مسئلہ میں بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان کی بحث چھیڑ کر اپنے عدم تدبر ہی نہیں بلکہ روحِ اسلامی سے پوری ناواقفیت بلکہ یوں کہئے بغاوت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ وہ تعصبِ جاہلیہ کی آواز ہے جو اسلام سے پہلے دنیا میں سنائی دیتی تھی اور جسے مٹانے کیلئے اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مقام پر دو مسلمانوں میں کسی معاملہ پر جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے نے ذرا طول پکڑا تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلہ (عوف) کو حمایت کیلئے بلایا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ (غطفان) کے حلیفوں کو آواز دی۔ حضور سرورِ کائنات (علیہ التحیۃ والسلام) کے سمعِ مبارک میں یہ آواز پہنچی تو غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا اور خیمہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا ابھی تک عہدِ جاہلیہ کے امتیازات تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکے! یہ عوفی اور غطفانی کی تفریق کفر کی نشانی ہے۔ اسلام ان سب کو مٹانے کیلئے آیا ہے۔ عجیب اتفاق ہوا کہ ہمارے اس بھائی نے اپنے غصہ میں جو اس وحدت کا توازن کھو کر یہ غیر اسلامی آواز بلند کردی۔ الحمدللہ کہ بنگال کے مسلمان نے اشتعال پرستی کی بجائے حق پرستی کا ثبوت دیا اور اپنے "وزیر اعظم" کی اس آواز کا جواب اس استنکار و تنفر سے دیا جس کی یہ مستحق تھی۔ بنگال کے مسلمان بھائیو! تم پر اللہ کی رحمتیں ہوں تم نے بڑی ہوشمندی اور اسلام دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں جناب فضل الحق صاحب نے پیہم غلطی پر غلطی کرکے اپنے آپ کو مضحکہ بنا دیا۔

حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا ∴ سمجھے تھے دل میں خدا ہوگئے ہم

لیکن بایں ہمہ ہم ابھی تک اپنے اس مغلوب الغضب بھائی سے مایوس نہیں ہیں۔ جیسا کہ جناب جناح نے اپنے بیان میں فرمایا ہے۔ جب ان کے غیظ و غضب کا چڑھتا ہوا دریا کچھ وقت کے بعد سکون آشنا ہوگا تو یہ اپنے کئے پر فوراً پشیمان ہوں گے اس لئے

عادت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں۔

خدا کرے کہ شملہ میں ان کے اشہب عناں گسیختہ کو کوئی نئی مہمیز نہ مل جائے۔

اس تمام حدیثِ الم انگیز میں ایک ٹکڑا بڑا دلچسپ ہے یعنی مسلم لیگ کے فیصلہ کی مخالفت اور جناب فضل الحق صاحب کی حمایت میں سر عبدالحلیم صاحب غزنوی بہت پیش پیش رہے۔ حیرت ہے کہ جناب فضل الحق صاحب نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ یہ "حبِ علیؓ" نہیں "بغضِ معاویہؓ" ہے جس نے جناب غزنوی کو ان کی حمایت کیلئے بیتاب کر دیا ہے۔ غزنوی صاحب وہی ہیں جنہیں لیگ نے برادری سے خارج کر رکھا ہے۔ افسوس ہوا کہ جناب فضل الحق صاحب کو حمایتی بھی ملے تو کس قسم کے۔

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لیکن اس سے زیادہ افسوس ہے خود جناب فضل الحق صاحب پر جنہوں نے ان کی حمایت کا استقبال کیا۔ جس زمانہ میں حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ میں باہمی آویزش تھی تو روم کے قیصر نے حضرت معاویہؓ کو کہلا بھیجا کہ آپ چاہیں تو میں ایک لشکرِ جرار آپ کی مدد کیلئے بھیجوں آپ نے جواب میں کہا کہ اے بدبخت! اگر تیرے لشکر نے ادھر کا رخ کیا تو میں سب سے پہلا سپاہی ہوں گا جو حضرت علیؓ کی طرف سے اس لشکر کے خلاف میدانِ جنگ میں آئیگا۔ جناب فضل الحق صاحب کو کم از کم اتنا تو سوچنا چاہئے تھا کہ یہ حمایت کی آواز اٹھ کہاں سے رہی ہے۔

جناب فضل الحق صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مجھے بنگال اور بیرونِ بنگال کے جمعیۃ العلماء کے اراکین نے بھی لکھا ہے کہ میں ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دوں" (ہندوستان ٹائمز ۱۱ جون) یہ ایک دلچسپ خبر ہے۔ جہانتک ہمیں معلوم ہے جمعیۃ العلماء کی طرف سے اس بیان کی تردید شائع نہیں ہوئی، اسلئے یہ استعجاب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جنگ یا ڈیفنس کونسل وغیرہ کے مسئلہ میں جمعیۃ العلماء (یعنی کانگرسی مسلمانوں) کا مسلک اضح ہے۔ اسکے باوجود جناب فضل الحق صاحب کو یہ مشورہ دینا کہ ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دیدو مسلمانوں میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کی مکروہ کوشش کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ انسان جب گرنے پر آتا ہے تو کس طرح اسفل سافلین کے درجے پر پہنچ جاتا ہے! اور جناب فضل الحق صاحب ہیں کہ اس مشورہ کو بھی فخر کے ساتھ شائع فرماتے ہیں!!

غرضیکہ اس افسوسناک واقعہ کے کس کس پہلو پر آنسو بہائیے!

ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد کسی کو اس پر تعجب نہیں ہوگا کہ یہ بڑے میاں کیا کر رہے ہیں۔ لیکن فضل الحق صاحب سے زیادہ تعجب تو ان بنگالی بھائیوں پر ہے جنہوں نے انھیں اپنا نمائندہ چنا اور فقط نمائندہ ہی نہیں بلکہ صوبہ کی وزارتِ عظمیٰ کی کرسی بھی ان کے سپرد کر دی۔ جس کشتی کا ناخدا ایسا ہو اس کشتی کا خدا حافظ۔ ہم بنگال کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ انھوں نے صوبہ کی زمام حکومت ان کے سپرد کر کے اپنے لئے کتنی بڑی مصیبت اور پاکستان کیلئے کتنا بڑا خطرہ مول لے لیا ہے۔

رفتارِ عالم

ان دنوں دنیا بھر کی نظریں جینوا پر مرکوز ہیں۔ جینوا نے تاریخ کے بڑے بڑے دور دیکھے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر یہ شہر عالمگیر رجحانات کی آماجگاہ بنا اور اسوقت سے لیکر اب تک اس کے اسٹیج پر بہت سے کھیل کھیلے گئے جنھوں نے واقعاتِ عالم کا رخ بدل دیا۔ آج پھر اس سٹیج پر چہل پہل ہے۔ اور

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ایک عالم اس انتظار میں ہے کہ دورِ عظمیٰ کے اکابرین انسانیت کو کیا پیغام دیتے ہیں۔ کانفرنس ۲۶ اپریل کو شروع ہوئی تاکہ کوریا کا پرامن تصفیہ کیا جائے اور ہند چینی میں امن بحال کیا جائے۔ جینوا کانفرنس کا انعقاد ایک لحاظ سے روسی تدبر کی کامیابی تھی کیونکہ پہلی مرتبہ اشتراکی چین عالمی مذاکرات میں شریک ہو رہا تھا۔ امریکہ نے اس کامیابی کا یوں استخفاف کیا کہ چین داعی قوی میں سے نہیں، نہ اسے تسلیم ہی کیا گیا ہے۔ اس کے باوصف اشتراکیوں نے اس پر کافی زور دیا کہ اشتراکی چین بالآخر اقوامِ عالم کی صف میں آگیا ہے۔ اسی کے پیش نظر ابتدا ہی میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ چین کو کانفرنس کی صدارت کا حق دیا جائے یا نہ۔ روس کا اصرار تھا کہ ضرور حق دیا جائے۔ بظاہر ایسا ہونا چاہئے تھا کیونکہ ایسی کانفرنسوں میں صدارت باری باری سے شرکاء میں بدلتی رہتی ہے۔ لیکن مغربی طاقتیں اشتراکی چین کی اس عزت افزائی کے لئے تیار نہ تھیں۔ چنانچہ اس کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ صدارت روس، برطانیہ اور ایک غیر جانبدار ملک ــــ تھائی لینڈ ــــ کے حصہ میں آئے۔

جینوا کانفرنس مبادیات سے فارغ ہو کر کوریا کا معاملہ زیر بحث آیا۔ جنوبی کوریا کی طرف سے اس کا حل یہ پیش کیا گیا کہ شمال (یعنی اشتراکی) کوریا میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں انتخابات کرائے جائیں۔ اسے بعد میں یوں بدل دیا گیا کہ پورے کوریا میں انتخابات منعقد ہوں تاکہ ملک کو پھر سے متحد کیا جا سکے لیکن اشتراکیوں نے ان تجویزوں کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ گو جینوا کانفرنس کوریا کے تصفیہ کیلئے منعقد ہونا قرار پائی تھی لیکن اشتراکیوں کی چالوں نے اسے ضمنی حیثیت دیدی اور ہند چینی کے مسئلے کو جو شروع میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا کوریا پر مقدم کر دیا۔ اس فضا میں کوریا کے مسئلے کا ملتوی ہو جانا قطعاً ناقابل فہم نہیں۔ ہند چینی کی جنگ گذشتہ سات سال سے جاری ہے اور اس نے فرانس کو ادھ موا کر دیا ہے۔ فرانس میں اس جنگ سے بیزاری کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں جو اسکی غیر معمولی تھکن کا نتیجہ ہیں۔ فرانس عظیم تذبذب میں گرفتار تھا۔ یا تو وہ ہر قیمت پر صلح کرلے اور ملک کو اشتراکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے یا اس جنگ کو بین الاقوامی بنا دے۔ دوسری صورت کا عملی پہلو یہ تھا کہ امریکہ اس جنگ میں باقاعدہ شریک ہو جائے۔ امریکہ کے نقطہ نگاہ سے بھی صورت تذبذب کی ہے۔ وہ ایشیا میں اشتراکیت کی فتوحات کو یک قلم روک دینا چاہتا ہے۔ امریکی رائے عامہ کلیتہً اس کے حق میں ہے لیکن کوریا کے تجربے کے بعد امریکی رائے عامہ اپنی سپاہ ایشیا کے میدانوں میں ذبح کرانے کے حق میں نہیں۔ فرانس اور امریکہ کے دوگونہ تضادات قائدین امریکہ کیلئے دردِ سر ہیں۔ اس کا فائدہ اشتراکیوں نے خوب اٹھایا۔ کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ ہند چینی کے ایک مقام دین بین فو پر اشتراکی افواج نے ہجوم کر دیا ہے۔ یہ مقام فوجی اعتبار سے اہم تھا کیونکہ اس کے بعد ہند چینی کے زرخیز علاقے اشتراکیوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ فرانس نے بھی اپنی بہت سی فوجیں اس مقام پر جمع کر رکھی تھی۔ دین بین فو طرفین کیلئے وقار کا بھی سوال ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ویٹ منھ افواج کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ فرانس نے جم کر مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے کم و بیش دس ہزار سپاہی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ دین بین فو کا زوال فرانس پر کاری ضرب ہے۔ اس کا جینوا میں اس کی پوزیشن کمزور تر ہو گئی ہے۔ فرانس کے وزیر خارجہ مسٹر بیدو نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ جینوا میں دین بین فو کے بچاؤ کا کچھ انتظام ہو سکے لیکن کوئی بات نہ بن سکی۔ انھوں نے

ہند چینی کیلئے یہ تجویز پیش کی کہ جنگ ملتوی کردی جائے' قیدیوں کو رہا کردیا جائے' گوریلوں کو غیر مسلح کردیا جائے' لاؤس اور کمبوڈیا سے ویٹ منھ کی فوجوں کو واپس بلالیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ان معاہدات کی نگرانی بین الاقوامی ہو۔ صحیح الفاظ میں تجویز ہند چینی کی تقسیم کے مترادف تھی اور چونکہ اس سے اشتراکیوں کو بہت سے علاقے خالی کرنے پڑتے تھے اسلئے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اسے مان لیں گے۔ وہ مانتے بھی کیسے؟ وہ جانتے تھے کہ دین بین فو میں کیا ہو رہا ہے۔

یہ مذاکرات ہو رہے تھے کہ فرانس کی شکست کی خبر آئی۔ اس پر اشتراکیوں کا رویہ سخت تر ہو گیا اور انھوں نے یہ جوابی تجاویز پیش کیں' التوائے جنگ کے بعد غیر ملکی فوجیں واپس بلالی جائیں اور آئندہ انھیں ملک میں نہ آنے دیا جائے (یعنی نہ فرانسیسی فوجیں آسکیں نہ امریکی امداد مل سکے)' ویٹ منھ کی فوجیں اور گوریلے جہاں ہیں وہیں اور اسی حال میں رہیں' ملک بھر میں انتخابات کرائے جائیں اور ہند چینی کی تینوں ریاستوں کو علیحدہ علیحدہ فرانس سے اپنے تعلقات استوار کرنے میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ سیدھے الفاظ میں ان تجاویز کا مطلب یہ ہے کہ سارے ملک کو ہضم کرلیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرائط بجنسہ منظور نہیں کی جاسکیں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیوں کا پلڑا اس سودابازی میں فی الحال بھاری ہے۔

امریکہ کے عزائم

فرانس اپنی جگہ سودابازی کے ناقابل ہو گیا ہے۔ اس کی مزید کمزوری یہ ہے کہ اس کے اپنے حلیف بھی پوری طرح اس کے ساتھ نہیں امریکہ کے معتمد خارجہ مسٹر ڈلنر نے' جو جنیوا سے واپس چلے گئے ہیں اور مذاکرات کی ذمہ داری اپنے نائب پر ڈال گئے ہیں' حال ہی میں کہا ہے کہ ہند چینی اشتراکی فتوحات کو روکنے کیلئے ناگزیر نہیں۔ گو صدر آئزن ہاور نے یہ کہہ دیا ہے کہ اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کمیونسٹوں کو ہند چینی ہڑپ کرنے کا موقع دیدیا جائیگا لیکن فرانس کا اس اعلان سے مایوس ہونا قابل فہم ہے۔ امریکہ کے نزدیک دراصل سوال ہند چینی کی فتح و شکست کا نہیں بلکہ یہ عمومی سوال ہے کہ ایشیا میں اشتراکیت کو پھیلنے سے کیسے روکا جائے۔ اس سلسلہ میں اس کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ تمام متعلقہ اقوام مل کر ہند چینی میں متحدہ اقدام کا فیصلہ کریں۔ اس اقدام کی برطانیہ اور فرانس نے بدیں غرض مخالفت کی کہ اس سے خواہ مخواہ جنیوا کانفرنس پر برا اثر پڑیگا' لہذا ایسا اقدام کانفرنس کے نتائج دیکھ کر ہی کیا جائیگا۔ اس سے اقوام مغرب کے باہمی اختلافات اور نمایاں ہو گئے چنانچہ کانفرنس کے آغاز پر جہاں اشتراکی مندوبین متحد و متفق تھے' وہاں مغربی نمائندے ہم خیال نہیں تھے۔ امریکہ نے بہرحال اپنی مساعی کو جاری رکھا اور برطانیہ اور فرانس سے یہ اصول منوا لیا کہ ہند چینی کا تصفیہ کچھ ہی ہو اور جنیوا کا اونٹ کسی کروٹ ہی کیوں نہ بیٹھے ایشیائی اقوام کی ایک دفاعی تنظیم ضرور تشکیل ہونی چاہئے۔ اس تنظیم میں جسے SEATO ' SEADO اور SATO کے متفرق ناموں سے یاد کیا جا رہا ہے دس اقوام شریک ہونگی یعنی امریکہ' برطانیہ' فرانس' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' فلپائن' ویٹ نام' لاؤس' کمبوڈیا' تھائی لینڈ۔ امریکہ اب اسی خاکے میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔ دوسری غیر اشتراکی اقوام ایشیا سے متعلق یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ وہ اس تنظیم میں شریک ہو جائیں گی' البتہ انہی دس اقوام سے آغاز کار کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی دخل اندازی

ہندوستان نے اس تنظیم میں دخل اندازی کرنے کی ضرور کوشش کی۔ برطانیہ اس تجویز سے اتفاق کرنے میں اسلئے پس و پیش کر رہا تھا کہ یہ دولت مشترکہ کے ممالک بالخصوص ہندوستان کو اس کا قائل نہیں کر سکے گا۔ اس سے ہندوستان کو شہ ملی اور اس نے اعلان کیا کہ اگر تمام ایشیائی اقوام آمادہ بہ شرکت ہوں تو وہ بھی شرکت پر تیار ہو جائیگا۔ ایک امریکی مبصر کے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ برطانیہ اسوقت تک شریک نہیں ہو گا جبتک ہندوستان رضامند نہ ہو جائے' اور ہندوستان اسوقت تک رضامند نہیں ہو گا جب تک کہ چین اور روس تیار نہ ہو جائیں۔ اس طرح مغربی لائحہ عمل معطل ہو جائے گا۔ بالآخر برطانیہ نے اپنا رویہ تبدیل کر دیا اور پنڈت نہرو کے تغیر آباد' یہ گھنگھور ہو گیا۔ ہندوستان نے جنیوا کانفرنس پر اپنا سایہ ڈالنے کی دوسری کوشش کولمبو کی۔ ایک عرصے کولمبو میں پانچ ایشیائی وزرائے اعظم کے مذاکرات کی باہمی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کانفرنس کے داعی سیلون کے وزیراعظم سر جان کوٹلے والا تھے اور

مدعوین تھے، پاکستان، برما، انڈونیشیا اور ہندوستان۔ اس کانفرنس کا کوئی طے شدہ ایجنڈا نہیں تھا اور مطلب یہ تھا کہ باہمی طور پر مل جل کر بیٹھا جائے اور مشترک مسائل پر تبادلہ خیالات کیا جائے۔ پنڈت نہرو اس سنہری موقع کو کیسے ضائع کر سکتے تھے۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ جینوا کانفرنس پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ ایشیا کے مسائل کا حل ان کے بغیر ممکن نہیں نیز وہی ایشیا کے مطالبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں۔ ہر چند ان ایشیائی ممالک کے مابین اختلافی مسائل موجود تھے۔ مثلاً کشمیر کا مسئلہ اور سیلون میں ہندوستانیوں کا مستقبل وغیرہ۔ لیکن انھیں نظر انداز کر دیا گیا اور کانفرنس کا افتتاح ہند چینی سے ہوا۔ پنڈت نہرو نے متحارب فریقین سے اپیل کی کہ وہ جنگ فی الفور بند کر دیں اور امن بحال کریں۔ اس پر پاکستانی وزیر اعظم نے اعتراض کیا کہ جب آپ کشمیر جیسے مسئلہ کو باہمی طور پر حل کرنے سے قاصر ہیں تو یہ کیسے زیب دیتا ہے کہ دوسری اقوام سے امن کی اپیل کی جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ غیر ملکی افواج ہند چینی سے نکل جائیں۔ اس پر پھر پاکستان نے اعتراض کیا کہ جب تک یہ انتظام نہیں ہو جاتا کہ ہند چینی کو پھر سے اشتراکیت نگل نہیں جائیگی اس قسم کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے۔ سیلون اور برما نے پاکستان کی تائید کی اور پنڈت جی کو اپنا قدم چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ جو قرارداد منظور ہوئی اس میں التوائے جنگ کی اپیل بھی اور فرانس سے یہ مطالبہ کہ وہ ہند چینی کی آزادی کو تسلیم کرلے۔

ہند چینی کے بعد ہائیڈروجن بم اور استعماریت کے موضوع زیر بحث آئے اس پر بھی پنڈت نہرو نے اشتراکی راہ عمل اختیار کی لیکن پاکستان اور دیگر ممالک کی مخالفت پر انھیں جھکنا پڑا۔ کولمبو کانفرنس نے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کا دعوئے قیادت ایشیا بالکل باطل ہے لیکن ہندوستان بدستور قیادت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ غیر اشتراکی ایشیا کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے تاکہ ایک طرف وہ اشتراکی سیلاب کا حریف ہو سکے، دوسری طرف اقوام مغرب سے سودا بازی کر سکے۔ چونکہ امریکہ اپنی ضرورت کے تحت ہندوستان کو امداد دے رہا ہے اور یہ امداد اسے بہر حال ملتی رہے گی، اسلئے ہندوستان نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں وہ اشتراکیوں کی حمایت کرتا رہے تاکہ ایک طرف وہ اس سے خوش رہیں، دوسرے امریکہ اس ڈر سے ہندوستان کی خوشامد کرتا رہے کہ اگر اسے راضی نہ رکھا تو یہ اشتراکی ہو جائیگا۔ اشتراکی ہندوستان کی اس کمزوری کو سمجھتے ہیں اسلئے وہ بھی وقت پڑنے پر ہندوستان کو اکساتے رہتے ہیں، ان کا مقصد ظاہر ہے۔ وہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان اقوام مغرب سے دور رہے۔ ہندوستان یہ سمجھتا ہے کہ اشتراکی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

متضاد پالیسی

ہندوستان نے پاکستان کے معاملہ میں تو یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ امریکی امداد سے توازن قوی بدل گیا ہے لیکن چین کے معاملہ میں اس کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اشتراکی چین دیکھتے دیکھتے تبت پر قابض ہو گیا جس سے ہندوستان میں تشویش و اضطراب کی عام لہر دوڑ گئی۔ یہ تشویش قابل فہم تھی کیونکہ تبت اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں اور اکثر جگہ غیر متعین ہیں۔ چنانچہ اس طرح چینیوں نے بعض ایسے نقاط بھی سنبھال لئے جو ہندوستان اپنے علاقے میں سمجھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان نے تبت کے شہر گیانتسی میں جو فوج تجارت کی حفاظت کیلئے رکھی ہوئی تھی اسے بھی چینیوں نے بے دخل کر دیا۔ اس پر چین اور ہندوستان کے مابین مذاکرات شروع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی فوج کوریا میں جنگی قیدیوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ ان مذاکرات کی رفتار کا یہ حال رہا کہ جب ہندوستان کوریا میں کوئی بات اشتراکی مفاد کی کرتا تھا چینی اس سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ورنہ وہ کھچے کھچے رہتے تھے۔ مذاکرات کو بہر حال صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ مہینوں کے بعد بالآخر ہندوستان اور چین میں ایک "تجارتی" معاہدہ طے پایا۔ اس کی رو سے تبت سے ہندوستان کی فوجوں کو نکال دیا گیا۔ چین نے ہندوستان میں تین جگہ تجارتی مرکز کھولنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ہندوستانی تبت میں صرف چھ معین راستوں سے داخل ہو سکیں گے اور سنکیانگ کا علاقہ ان کیلئے ممنوع ہوگا۔ اور سب سے اہم یہ کہ ہندوستان نے تبت کو چینی علاقہ تسلیم کر لیا۔ یہ معاہدہ کھلا ہوا اعتراف ہے ہندوستان کی طرف سے کہ چین کے اشتراکی ہونے اور تبت پر قابض ہونے سے جو توازن قوی بدلا ہے، اس پر ہندوستان صاد کرتا ہے۔ ہندوستان چین کے معاملہ

میں تو بالکل خاموش ہے لیکن پاکستان کے امریکہ سے استمداد کرنے پر وہ آپے سے باہر ہوگیا ہے۔

ترکی مئی کے پہلے ہفتے میں ترکی میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ترکی کے یہ تیسرے عمومی انتخابات ہیں۔ پہلے انتخابات اتاترک کی وفات کے آٹھ سال بعد ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئے تھے۔ اس وقت عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی برسر اقتدار آئی۔ یہی پارٹی اتاترک کی برسر اقتدار تھی گو ترکی میں صرف ایک ہی پارٹی کا وجود تھا۔ ۱۹۵۰ء کے دوسرے انتخابات میں ری پبلکن پارٹی شکست کھا گئی اور اس کی بجائے ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی۔ چار سال کی حکومت کے بعد یہ پارٹی کثرت رائے سے پھر عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ ترکی کے چونسٹھ صوبوں میں کوئی ایک کروڑ اکاون لاکھ ووٹروں نے ڈیموکریٹک پارٹی کو کامیاب بنایا۔ ان انتخابات میں ترکی کی خارجہ پالیسی میں کوئی اختلاف نہیں تھا البتہ اندرونی معاملات استخوان نزاع تھے۔ انتخابات کے انداز سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ترکی نے جمہوریت کو کس حد تک اپنا لیا ہے۔

مصر مصر کا اندرونی خلفشار بدستور پھوٹتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اب البتہ اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کرنل ناصر نے جنرل نجیب پر فتح حاصل کر لی ہے لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ یہ نزاع ختم ہوگئی ہے۔ جنرل نجیب اب محض برائے نام صدر بنا دیئے گئے ہیں اور حکومت کے کرتا دھرتا کرنل ناصر بن گئے ہیں۔ انھوں نے نہ محض سیاسی جماعتوں کو پھر سے میدان میں نہیں آنے دیا بلکہ فوج میں سے بھی جنرل نجیب کے آدمی چن چن کر ختم کر دیئے ہیں۔ مئی کے اوائل میں گرفتاریوں کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ان پر الزام یہ ہے کہ یا تو وہ طلبہ کو بھڑکا رہے تھے یا فوج کو آمادہ بہ بغاوت کر رہے تھے۔ اس کی ذمہ داری جنرل نجیب پر بھی ڈالی گئی۔ اب گرفتار شدگان پر فوجی عدالتوں میں مقدمے چلائے جائیں گے اور اس کے مطابق سزائیں دی جائیں گی۔ ارباب اقتدار جنگ زرگری میں الجھ جائیں تو نظم سیاسی و معاشرتی کا جو حشر ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملک چند در چند معاشی مشکلات میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا فائدہ بالآخر اشتراکی اٹھائیں گے۔

فلسطین یہودیت کا ناسور عربی جسد سیاست پر ویسے کا ویسا رستا ہوا ناسور ہے جیسے کہ آج سے پورے چھ سال پہلے تھا جبکہ فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم ہوئی۔ یہودی حکومت کی سرحدات پر آئے دن ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں اور یہودی زیادہ سختی سے عربی رگ جان پر پنجے گاڑتے جاتے ہیں۔ اب فلسطین کا مسئلہ عجیب نوعیت اختیار کر چکا ہے۔ اقوام مغرب مصر ہیں کہ عربوں اور اسرائیلیوں میں کوئی مستقل معاہدہ امن ہو جائے۔ یہودی اس خیال سے کہ امن ان کیلئے بہرحال موجودہ عارضی صلح سے بہتر ہوگا کیونکہ اس میں عربوں کی تسلیم و رضامندی پائی جائے گی، اس کوشش میں ہیں کہ معاملہ اقوام متحدہ تک پہنچایا جائے۔ عرب ایسا کرنا نہیں چاہتے کیونکہ انھوں نے ابھی تک اسرائیلی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اسرائیلی حکومت سے امن کا معاہدہ طے کرنا نہیں چاہتے۔ روس عربوں کی ہمدردی کا دم بھر رہا ہے حالانکہ یہودی حکومت کے قیام میں اس کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا امریکہ یا برطانیہ کا تھا لیکن وہ موجودہ متضاد صورت حال کو اپنے حق میں ضرور استعمال کر رہا ہے۔ اس کی یہ بھی کوشش ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ وہ اقوام متحدہ میں ویٹو تک استعمال کرنے کیلئے تیار ہے۔ روسی ویٹو کے ڈر سے برطانیہ اور امریکہ بھی کسی قسم کی عملی تجویز پیش کرنے سے گھبراتے ہیں۔ گویا فلسطین کے قضیے کا کوئی حل بن پڑتا نظر نہیں آتا۔ پچھلے دنوں پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ فلسطین کو عالم اسلام کا مشترکہ مسئلہ سمجھا جائے اور اسی حیثیت سے اسے حل کیا جائے۔ سعودی عرب کے سفیر پاکستان نے حال ہی میں یہ اعلان کیا کہ شاہ سعود یروشلم میں عالم اسلام کی ایک موتمر طلب کرنا چاہتے ہیں تاکہ فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل سوچا جائے۔ نظری اعتبار سے یہ تجویزیں اپنی اپنی جگہ دونوں صحیح ہیں۔ فلسطین تو کیا مسلمانوں کا ہر مسئلہ عالم اسلام کا مشترکہ مسئلہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان

اس اتحاد و یک جہتی کا ثبوت دینے کیلئے تیار ہیں جو مشترکہ مسائل حل کرنے کیلئے ناگزیر ہے؟ اسی فلسطین کے معاملہ میں تمام عرب ممالک متحد ہو گئے تھے لیکن اس اتحاد نے جو گل کھلائے ان سے سارا چمن آج تک شرمندہ ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیلیوں کے خلاف لڑتے ہوئے عربی ممالک نے ایک دوسرے کے خلاف یہودیوں کی مدد کی۔ کیونکہ وہ درحقیقت یہ سمجھتے تھے کہ یہودیوں سے کہیں زیادہ انھیں ایک دوسرے سے خطرہ ہے۔ ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں مضبوط تر ہو جانا چاہتا تھا۔ آج تک اس منافقت کی سزا عربوں کو مل رہی ہے۔ اس اتحاد کے علاوہ دنیائے اسلام عملاً کسی ایک مسئلہ پر کبھی متحد نہیں ہوئی کیونکہ کوئی عملی قدم اٹھایا ہی نہیں گیا۔ زبانی جمع خرچ البتہ بہت ہوا خود پاکستان نے کانفرنسوں کے انبار پر انبار لگا دیئے۔ دنیائے اسلام کے کونے کونے سے قائدین کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔ نعرے لگتے رہے، دعوتیں ہوتی رہیں، اور بات آئی گئی ہو جاتی رہی۔ اب یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان دعوتوں کا حشر ان سے مختلف ہوگا۔ چودھری ظفر اللہ خاں کو ایسی تجویز پیش کرنے سے بھی گریز کرنا چاہیے تھا انھیں یاد ہوگا کہ کوئی دو سال پیشتر انھوں نے ممالک اسلامیہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس طلب کرنے کا قصد کیا تھا۔ اس کیلئے قریباً تاریخیں بھی مقرر ہو گئی تھیں لیکن بالآخر غیر رسمی طور پر اس تجویز کو دفن کر دیا گیا۔ کسی مسئلہ پر متفق ہونے سے پیشتر ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان حکومتیں ایک ایسا مشترکہ ادارہ قائم کریں جو ان کیلئے مشترکہ لائحہ عمل تجویز کرے اور جس کے فیصلے تمام ارکان کیلئے ناطق ہوں۔ عالم اسلامی کی موجودہ قیادت سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔

زمانے کے تقاضے

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کے تقاضے مسلمانانِ عالم کو متحد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کا پہلا مظاہرہ ترکی اور پاکستان کے مابین حالیہ معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے ترکی اور پاکستان مغربی محاذ میں شریک ہو جاتے ہیں جس سے توقع ہو سکتی ہے کہ ان کے طریق ہائے کار بھی یکساں ہونگے عراق اس معاہدے میں شریک نہیں ہوا لیکن وہ عربی حکمت عملی کے علی الرغم امریکہ سے فوجی امداد لے رہا ہے۔ شاہ عراق کے ورود پاکستان کو سیاسی حلقوں میں کافی اہمیت دی گئی تھی اور اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلاوجہ نہیں تھی۔ عراق کی اپنی درخواست پر امریکہ نے اسے فوجی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور امریکی فوجی مشن عراق کا دورہ بھی کر رہا ہے تاکہ یہ تخمینہ لگائے کہ کس قسم کی اور کتنی فوجی امداد کی ضرورت ہوگی۔ سعودی عرب کے متعلق بھی اطلاعیں آ رہی ہیں کہ امریکی امداد کے حصول کیلئے مذاکرات جاری ہیں۔ سعودی عرب ایک مرتبہ امریکی امداد کو مسترد کر چکا ہے۔ ایسے مذاکرات کا ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ ممالک عربیہ اس قابل نہیں کہ دفاع کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورے کر سکیں نیز معاشی اصلاح و ترفیع کیلئے ضروری اقدامات کر سکیں۔ یہ دوگونہ تقاضے امریکی امداد سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ اس امداد کا ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ ممالک اسلامیہ ایک ہی محاذ میں شامل ہو جائیں گے اور ایک مشترکہ لائحہ عمل پر کاربند۔ ایک لحاظ سے یہ اتحاد خارج سے آئیگا لیکن زمانہ کب تک مسلمانوں کی عملی کاہلی کا تماشا کرتا رہے گا!

شامتِ اعمالِ ما

پاکستان ایک عظیم الشان بحران سے گذر رہا ہے۔ یہ بحران اس کے اپنے "عمل" کی سزا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے اندھے مسافر کی سی ہے جو اندھیرے میں ٹکریں مار مار کر ذوقِ سفر سے محروم ہو چکا ہو۔ پاکستان کا قیام عصری تاریخ میں ایک منفرد واقعہ تھا۔ اس کا شمار تاریخ عالم کے ان معدودے چند واقعات میں ہو سکتا تھا جن سے انسانیت نئے موڑ مڑنے کے قابل ہوئی اور آج ان کے دم سے موجودہ مقام تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملے گی کہ ایک قوم نے ہمہ گیر مخالفت کے علی الرغم اپنے نصب العین کو وطن کی صورت میں متشکل کیا اور پھر اسی عمارت کے شکست و ریخت کے درپے ہو گئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تحریک پاکستان مسلمانوں کے اعماقِ قلب سے یوں نہیں ابھری کہ وہ ان کی معاشرت کی بنیادوں تک کو اپنے قالب میں ڈھال لیتی۔ اس کے علاوہ جب پاکستان قائم ہوا تو اس کے بعد ایک بھی فکری تحریک ایسی ہمہ گیر نہیں ہو سکی جو ملت پاکستانیہ اسلامیہ میں مقاصد کا شعور پیدا کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ اقدار خاک میں مل چکی ہیں جن پر تحریک کی عمارت استوار کی گئی تھی اور ان کی عدم موجودگی میں ہر شخص اور ہر جماعت اپنی ہوس رانیوں اور ذاتی اقتدار و مفاد کے استحکام و تکمیل میں منہمک ہے۔ یہ حادثہ کسی ملک کیلئے بھی المناک ہو سکتا ہے۔ لیکن پاکستان ایسے ملک کیلئے جو ایک مقصد و تصور کی عملی تعبیر ہو، یہ حادثہ اور زیادہ المناک ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے ارباب اقتدار کی سیاست کے جملہ محرکات بخوبی آشکار ہو جاتے ہیں۔

جب مسلمان پاکستان کی سرزمین میں آکر آباد ہونا شروع ہوئے اور ہندوؤں نے چاروں طرف سے یلغاریں شروع کر دیں تاکہ اس نوزائیدہ مملکت کو فنا

گھاٹ اتار دیں تو ان میں ایک عزم پایا جاتا تھا۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر پاکستان کو محفوظ کرنے پر تیار تھے۔ ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ پاکستان مستحکم ہو اور اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آئے۔ وہ اسے اسلامی اقدار کی تجربہ گاہ بنانے کے متمنی تھے اور ان اقدار پر تمام اضافی نسبتیں قربان کر دینے پر تیار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ارباب حل و عقد کی نالائقی اور نااہلیت نے انھیں ایسے معاشی اور معاشرتی آلام میں مبتلا کر دیا کہ وہ ان جذبات لطیف و شریف سے بیگانے سے نظر آنے لگے۔ ان کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی اور وہ ہر راہرو کا ساتھ دینے لگے عام اس سے کہ وہ انھیں یقینی ہلاکت کی طرف ہی کیوں نہ لے جا رہا ہو۔ بدقسمتی سے اس طوفانِ بدتمیزی کا بے پناہ ریلہ بالخصوص بنگال سے آیا اور تمام پاکستانی اوصاف کو بہا کر لے گیا۔ خود وزیر اعظم پاکستان، جن سے بڑھ کر اور کوئی پاکستانی نہیں ہونا چاہئے، یہانتک کہہ گئے کہ وہ بنگال کے نمائندے کی حیثیت سے مجبور ہیں کہ بنگال کے صوبائی مطالبات کی تائید کریں۔ یہ کچھ انھوں نے انتخابات کی گہما گہمی میں کہا جبکہ انھیں اس قسم کے سستے وعدوں سے ووٹ حاصل ہونے کا خیال تھا۔ یہ وزیر اعظم اس مسلم لیگ کے صدر تھے جو بقول ان کے قائد اعظم کی مقدس میراث ہے اور جس نے بنگالی غیر بنگالی کے امتیازات مٹا کر ایک مسلم ملت کیلئے ایک پاکستان قائم کیا ہے۔ لیکن زمانہ کے انقلابات دیکھئے، اسی مسلم لیگ کے کرتا دھرتا پاکستان کے استیصال پر کمربستہ ہو گئے۔

بنگالی صوبائیت

ہر چند ان دلخراش واقعات کے دہرانے سے ہمیں سخت قلبی اذیت ہوتی ہے لیکن جب تک حقائق کو بے نقاب سامنے نہ رکھا جائے اصلاحِ حال کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم ان واقعات کو دہرانے پر مجبور ہیں۔ بنگال نے پہلے تو صوبائی مطالبات پیش کئے۔ ان کو ملازمتوں میں مقررہ تناسب ملے۔ ان کی زبان سرکاری زبان قرار پائے۔ انھیں مغربی پاکستان کے مقابلہ میں مساوات نیابت حاصل ہو وغیرہ وغیرہ۔ واضح رہے کہ اس قسم کے مطالبات بنگال کی طرف سے شروع ہی سے پیش نہیں ہوئے تھے۔ جب قائد اعظم نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں شدومد سے کہا کہ پاکستان کی قومی زبان ایک اور صرف ایک ہوگی اور وہ اردو ہے تو ان کے خلاف ایک آواز بھی نہیں اٹھی تھی لیکن جب ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین نے ڈھاکہ میں اردو کا نام لیا تو گولی چلانے تک کی نوبت آ گئی۔ یہ فتنے ارباب سیاست کے پیدا کردہ تھے۔ اگر آئینِ پاکستان شروع کے دو تین سالوں میں تیار ہو جاتا تو اسوقت مسلم ذہن کی کیفیت یہ تھی کہ اس قسم کے تنازعات پیدا ہی نہ ہوتے اور پاکستان ایک وحدانی طرز حکومت قائم کر لیتا۔ لیکن مرورِ وقت سے ایسے ایسے فتنے پیدا ہو گئے کہ ان کا سنبھالنا آسان کام نہیں۔ بہرحال پہلے تو بنگال نے صوبائیت کا زہر پھیلایا اور پھر اسے بنگالی نیشنلزم بنا دیا۔ اب اہل بنگال اس انداز سے بات کرتے ہیں گویا وہ مغربی پاکستان سے مختلف قوم ہیں اور وہ بحیثیت ایک علیحدہ قوم اپنے جداگانہ حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جہاں بنگالی آپس میں ایک دوسرے کے حریف ہیں وہاں وہ غیر بنگالیوں کے مقابلہ میں بالکل یک زبان ہیں۔ مثلاً جگتو فرنٹ نے مسلم لیگ کو شکست فاش دی، لیکن دبی پٹی ہوئی مسلم لیگ مرکز میں وہ کچھ کر کے دکھا رہی ہے جس کا جگتو فرنٹ نے اپنے ووٹروں سے وعدہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی مطلب برآری کے لئے مغربی پاکستان میں تفرقہ اندازی کر رہے ہیں تاکہ انھیں ادھر سے بھی مزید ووٹ حاصل ہو جائیں۔ اس پس منظر میں ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اردو کا مسئلہ کیسے نپٹایا گیا۔ مجلس دستور ساز ان دنوں بنیادی اصولوں کی رپورٹ پر غور کر رہی ہے۔ ان سفارشات میں زبان کے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ گویا رپورٹ پاس کرنے کے لئے دستوریہ کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ زبان کا سوال بھی اٹھائے۔ اس کے باوجود مسلم لیگی بنگالیوں نے زور دیا کہ اس مسئلہ کو ضرور فی الفور حل کیا جائے اور زبان سے متعلق نئے باب کا اضافہ کر دیا جائے۔ زبان کے معاملہ میں جس قسم کی نزاع پیدا ہو گئی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ اسے فی الوقت ملتوی کر دیا جاتا تاکہ جذبات ٹھنڈے ہونے پر اطمینان سے اس کا حل سوچ لیا جاتا، لیکن غیر معمولی تعجیل سے کام لیا گیا۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں اختلافات کی یہ حالت تھی کہ کوئی متفقہ حل نظر نہیں آتا تھا چنانچہ یہ مسئلہ ایک لسانی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا اور دھاندلی کی حد ہے کہ اسے آزاد نہیں چھوڑا گیا بلکہ معاملہ کمیٹی کے سپرد کرتے ہوئے یہ قرارداد پاس کی گئی کہ ملک کی قومی زبان اردو اور بنگالی ہوں اور اس کے ساتھ یہ پخ لگا دی کہ کمیٹی متبادل تجاویز بھی پیش کر سکتی ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا کمیٹی مجبور

تھی کہ اردو اور بنگالی کو برقرار رکھے یا اگر ایسا تھا تو متبادل تجاویز پیش کرنے کی اجازت کیا معنی رکھتی تھی؟ اگر ایسا نہیں تھا اور کمیٹی کو اختیار تھا کہ وہ جو تجویز مناسب سمجھتی پیش کر سکتی تھی تو اسے یہ کیوں کہا گیا کہ اردو اور بنگالی دونوں قومی زبانیں ہوں گی؟ یہ بنگالی ذہنیت کا آئینہ ہے اور اس کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔

سینہ تمام داغدار پنبہ کجا کجا نہم!

اکثریت کا نشہ جب اس کمیٹی نے بھی دونوں زبانوں کو برقرار رکھا تو ۲۲ اپریل کو کراچی میں ہڑتال منائی گئی۔ ہڑتال بالکل مکمل تھی جس سے اس فیصلہ کے خلاف ناراضی کا اندازہ ہوتا تھا۔ تیسرے پہر مولوی عبدالحق کی قیادت میں ایک احتجاجی جلوس مرتب ہوا جو گشت لگاتا ہوا مجلس دستور ساز تک گیا۔ دوسرے دن جب اس جلوس کی روئداد اخبارات میں شائع ہوئی تو ایک اخبار نے لکھا کہ شرکائے جلوس کی تعداد پانچ ہزار تھی، دوسرے نے دس ہزار تعداد بتائی، تیسرے نے ایک لاکھ اور چوتھے نے اسے لاکھوں کہا۔ اس پر یہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا کہ جلوس کی تعداد کونسی صحیح ہے؟ جس اخبار نے پانچ ہزار لکھا تھا اس سے باز پرس ہوئی۔ اس نے الزام ایسوسی ایٹڈ پریس پر ڈالا۔ دونوں میں سے ایک نے بھی جرأت سے یہ نہ کہا کہ تعداد وہی تھی جو انھوں نے لکھی۔ نہ دونوں نے اسے غلط کر کے معافی ہی مانگی۔ اخبار مذکور نے معترضین کو خوش کرنے کے لئے خبر رساں ایجنسی کی ڈائرکٹری سے استعفیٰ دیدیا درآنحالیکہ ان کی مدت بہت عرصہ پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اس سے قومی ذہن کے افق کی بلندی کا پتہ چلتا ہے اور جب حال یہ ہو تو پھر یہ افسوس بیکار ہے کہ قومی معاملات کا یہ حشر ہو رہا ہے۔ اس احتجاج کا دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے۔ مولوی عبدالحق اور ان کے رفقاء علمی لوگ ہیں اور عوامی تحریکیں چلانے کا تجربہ نہیں رکھتے۔ اس کا خطرہ یہ ہے کہ ان تحریکات کا فائدہ وہ لوگ اٹھاتے ہیں جن کے مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی کا یہ پہلو انتہائی افسوسناک ہے کہ اس وقت ایسے کارکن اور جماعتیں مفقود ہیں جو سیاسی تحریکات کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ نہ محض تحریکوں کی ناکامی کی دلیل ہے بلکہ منفعی لوگوں کیلئے دعوت عام ہے۔

بہرنوع یہ احتجاج ہوا تو لسانی فیصلے کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس سے توقع پیدا ہو چلی تھی کہ اب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن بنگالی حضرات آرام سے کہاں بیٹھ سکتے تھے۔ پارٹی پر پھر دباؤ ڈالا گیا اور اس فتنے کو پھر ابھارا گیا۔ پارٹی ایک رات اس کا حل کرنے بیٹھی۔ پارٹی کی تعداد ۷۵ ہے لیکن صرف ۱۹ حضرات نے لسانی فارمولا تیار کیا جو ملک پر تھوپ دیا گیا۔ اور کیا کس حال میں؟ رات کے ڈیڑھ بجے تک کچھ فیصلہ نہ ہو سکا تو بعض ارکان نے، جو دو زبانوں کے حق میں نہیں تھے، وزیراعظم سے درخواست کی کہ اس وقت فیصلہ نہ کیا جائے اور مزید غور دوسرے دن تک ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہوا لیکن جب یہ حضرات اجلاس سے چلے گئے تو بنگالی حضرات نے موقع غنیمت جانا اور وزیراعظم پر زور دیا کہ اسی وقت فیصلہ کر دیا جائے۔ وزیراعظم صاحب مان گئے اور فوراً لسانی فارمولا تیار ہو گیا۔ دوسرے دن یہ لسانی فارمولا مجلس دستور ساز میں پیش ہوا۔ پارٹی نے ارکان کی زبان بندی کر دی اور اس کے حق میں خاموشی سے ووٹ دینے کا حکم صادر کیا۔ اس زبان بندی کے خلاف خاموش احتجاج کرتے ہوئے مرکزی کابینہ کے سات وزراء دستور ساز کے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ مغربی پاکستان کے اور بہت سے ارکان بھی احتجاجاً شریک نہیں ہوئے۔ لیکن فارمولا پاس کر دیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ہمارے بنگالی بھائیوں نے یہ کچھ محض اکثریت کے زعم پر کیا۔ یہیں تک ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے جن ارکان نے مجلس دستور ساز کے اجلاس میں شرکت نہیں کی وہ ان کے خلاف، قرارداد مذمت پاس کرنے پر مصر ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو مرکزی حکومت کیلئے یہ کٹھن مرحلہ ہے۔ مرکز کے بارہ وزیروں میں سے سات وزیر اس فیصلے کے خلاف ہیں۔ اگر جمہوریت کا پاس کرنا ہے تو خود حکومت کو مستعفی ہو جانا چاہئے لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے۔ اکثریت کے زعم میں الٹی ان کی مذمت ہو رہی ہے۔ اب یہ صورت حال پیدا کر دی گئی ہے کہ بنگال کی

ہندو مسلم مخلوط آبادی کی پاکستان بھر میں اکثریت ہے، لہٰذا وہ جو چاہیں گے فیصلے کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو فیصلے مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہوں گے دوسرے بنگالی مستقل اکثریت کے مالک ہو جائیں گے اور غیر بنگالی مستقلاً اقلیت میں رہیں گے۔ بعینہٖ یہ نقشہ ہندوستان میں تھا۔ وہاں ہندو کی مستقل اکثریت تھی اور مسلمان کی مستقل اقلیت۔ اسی کے خلاف مسلمان نے بغاوت کی اور پاکستان کا مطالبہ کیا۔ ہندوستان میں یہ قابل فہم تھا کیونکہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں تھیں۔ لیکن یہاں ہم اب تک یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں اور ایک ملک ہیں!

لمحۂ فکریہ! اس وقت ضرورت ہے کہ اس فتنے کو بخوبی سمجھا جائے اور اس کا علاج کیا جائے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم (بنگالی اور غیر بنگالی) ایک قوم ہیں یا نہیں۔ اگر ایک قوم نہیں تو پھر ہمیں اتحاد و وحدت کا نزاع ختم کر کے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ یہ ایک تلخ تجویز ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں گروہ باہمی طور پر اکٹھے اسی شکل میں رہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کرنے پر رضامند ہوں۔ اگر بنگالی، غیر بنگالیوں کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہیں تو انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس منافقت سے علیحدگی کا خطرہ بدرجہا بہتر ہے لیکن اگر وہ مل کر رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی ذہنیت بدلنا ہوگی۔ انھیں بنگالی کے بجائے پاکستانی نقطۂ نگاہ سے سوچنا ہوگا۔ مل جل کر رہنے کی اس وقت دو شکلیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک ملت ہوتے ہوئے ہم وحدانی طرز حکومت قائم کریں اور علاقائی نسبتیں ختم کر دیں۔ ایک مرکز ہو اور صوبوں کا امتیاز یا ختم کر دیا جائے یا محض نظم و نسق کی سہولت کے لئے رکھا جائے۔ اس ذیلی امتیاز سے کسی کو کسی قسم کی برتری حاصل نہ ہو۔ امتیاز ایک ہی ہو اور وہ پاکستان سے عبارت ہو۔ ایسے نظام حکومت میں فیصلے اکثریت سے طے پائیں گے لیکن یہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی نہ کہ بنگالیوں یا پنجابیوں کی۔ دوسری شکل فیڈریشن کی ہے۔ فیڈریشن کا اصول یہ ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی مساوی درجہ اور اختیارات رکھتے ہیں۔ اس میں اکثریت اور اقلیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی وحدت کسی دوسری وحدت پر تفوق حاصل نہیں کر سکتی۔ ہمارے بنگالی بھائی پاکستانیوں کو ایک قوم تسلیم کرتے ہوئے بھی نہ پہلی صورت کو مانتے ہیں نہ دوسری کو۔ وہ ہر حال میں اپنی اکثریت چاہتے ہیں اور بس۔ وہ بنگال کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دلوانا چاہتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اختیارات ان کے صوبے کو حاصل ہوں۔ اس کے برعکس وہ اب مرکز کو بھی مضبوط کرنا چاہتے ہیں تاکہ مرکز پر قابض ہو کر وہ مغربی پاکستان پر بھی حکومت کر سکیں اور یہاں کے ذرائع سے تمتع کر کے اپنے صوبے کو اور فائدہ پہنچا سکیں۔ اگر بنگالی پاکستانی بن کر آئیں تو مغربی پاکستان ان کا ہے لیکن اگر وہ اسے اپنا مقبوضہ بنانا چاہتے ہیں تو ایسی ذہنیت ایک قوم کے اندر کس طرح روا رکھی جا سکتی ہے!

لسانی فارمولا اس ذہنیت نے جو لسانی فارمولا تیار کیا اس میں اردو اور بنگالی کو قومی زبانیں بنا دیا گیا۔ ملک کی سرکاری زبان بیس سال کے لئے انگریزی ہوگی۔ دوسری صوبائی زبانیں بھی قومی زبانیں بن سکیں گی بشرطیکہ متعلقہ صوبائی اسمبلیاں ان کا مطالبہ کریں۔ گویا اب توقع کی جا سکتی ہے کہ پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی ضرور قومی زبانیں بن جائیں گی۔ اس ہفت زبانی کے باوصف فارمولے نے حکومت پر یہ بار ڈالا ہے کہ وہ ایک زبان تیار کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک زبان کیا ہوگی؟ اور کیسے تیار ہوگی؟ اس کا جواب ان سے نہ پوچھئے کیونکہ انھیں جنگ زرگری سے فرصت نہیں۔ پاکستانی بچوں کے لئے سکول میں یہ انتظام ہوگا کہ وہ چاہیں تو تعلیمی زبان کے علاوہ اردو، بنگالی اور عربی میں سے ایک یا دو زبانیں پڑھ لیں۔ گویا پابندی نہیں ہوگی بلکہ طلبہ کے جی میں آئے تو ان میں سے ایک یا دو زبانیں پڑھ لیں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ بنگال میں بنگالی پڑھی جائے گی اور زیادہ سے زیادہ عربی اور مغربی پاکستان میں اردو اور عربی۔ اس سے دونوں حصص ملک ایک دوسرے سے دور ہوتے جائیں گے اور حکومت اس انتظار میں رہے گی کہ کسی طرح

کوئی مشترک زبان جادو کے زور سے پیدا ہو جائے؟ یہ "فیصلہ" دراصل فیصلہ ہی نہیں۔ اس سے نہ اردو قومی زبان بنتی ہے نہ بنگالی۔ البتہ انگریزی زبان باقی رہ جاتی ہے۔ ماتم اس نام نہاد فیصلے کا نہیں، ماتم کرنا ہے اس ذہنیت کا جس کا یہ شرمندۂ تخلیق ہے اور جو پاکستان کے لئے مستقل خطرہ ہے!!

صوبائی سیاست

جب مرکز میں یہ ہو رہا ہو تو صوبوں میں کیا کچھ نہیں ہوگا! مشرقی پاکستان میں ڈیڑھ ماہ کے مذاکرات کے بعد دس وزیروں کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اب چودہ وزیروں میں سے سات فضل الحق صاحب کی اپنی پارٹی کے ہیں اور پانچ عوامی لیگ کے۔ حالانکہ عوامی لیگ کے ارکان کی تعداد مقابلتاً زیادہ ہے۔ دو وزیر نظام اسلام پارٹی کے ہیں۔ یہ توسیع کی دوسری قسط ہے۔ تیسری قسط پھر فرصت میں ہوگی اور اس میں ہندو بھی لئے جائیں گے۔ صوبے میں عجیب ٹریجڈی ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعلیٰ کلکتہ گئے تو انھوں نے پاکستان کے خلاف وہ زہر اگلا کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی عام آدمی سے سرزد ہوتا تو وہ جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ انھوں نے بوس برادران کو اپنا پیر و مرشد کہا اور ملک کو تقسیم کرنے والوں کو ملک کا دشمن قرار دیا۔ اس پردہ تعلّی سے کہتے پھرتے ہیں کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور انھوں نے پیش کی تھی۔ انھوں نے تقسیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مغربی بنگال والوں کو انھوں نے یقین دلایا کہ اس وقت وہ بٹ گئے ہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ سیاست کے کھیل عارضی ہوتے ہیں۔ آتی دفعہ انھیں یہ بھی تسلی دلائی کہ وہ پاکستان میں ان کے محافظ ہیں۔ فضل الحق صاحب پاکستان واپس آئے تو انھوں نے کسی ایک بات کا بھی انکار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ لوگ ان کی بات اچھی طرح نہیں سمجھے اور یہ کہ وہ خود بہت بڑے پاکستانی ہیں۔ مرکز نے بھی یہ تماشہ بڑے اطمینان سے دیکھا۔ مرکز یوں الجھا ہوا ہو اور وزیر اعلیٰ اس طرح بہک رہا ہو تو بالکل تعجب نہیں ہوگا کہ صوبے میں قیامت برپا ہو جائے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ کرنا فلی کے حادثۂ خونیں کی یاد ابھی تازہ تھی کہ نارائن گنج میں اچانک فساد ہو گیا۔ نارائن گنج ڈھاکہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے اور ڈھاکہ ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پاکستان کے جوٹ کے کارخانے ہیں۔ واضح رہے کہ تقسیم کے وقت ایک سو بارہ جوٹ کے کارخانے تھے وہ سارے کے سارے کلکتہ میں تھے حالانکہ جوٹ پاکستان میں پیدا ہوتی تھی۔ ہندوستان آج تک جوٹ پاکستان سے ناجائز طور پر لے جا لے جا کر اپنے کارخانے چلا رہا ہے اور اس کوشش میں رہتا ہے کہ پاکستان میں کارخانے نہ چل سکیں۔ پاکستانی کارخانوں کی بدولت پاکستانی جوٹ کی مصنوعات دیگر ممالک میں بھی جانا شروع ہو گئی ہیں۔ آدم جی مل، جس میں فساد ہوا، ایشیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے! ایسے کارخانے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس اہمیت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ان کارخانوں میں فسادات کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فائر بریگیڈ کے چند آدمیوں نے ایک ملازم کارخانہ سے کہا کہ ہوا تیز ہے اس لئے آگ نہ جلاؤ۔ اس پر بات بڑھ گئی — ایک آدمی قتل ہو گیا —— اور پھر جو ہنگامۂ کارزار برپا ہوا ہے تو سینکڑوں آدمی مارے گئے۔ عورتیں اور بچے ذبح ہوئے۔ گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ خود ڈھاکے میں راہگیروں پر حملے شروع ہو گئے۔ یہ بلوہ دو دن تک رہا لیکن مشرقی بنگال کی حکومت نے نہ لاٹھی چارج کیا نہ گولی۔ بلکہ اطلاع ملنے کے باوجود پولیس موقع واردات پر بہت دیر سے پہنچی۔ آس پاس کے گاؤں بھی اس بلوے میں شریک ہوئے اور درندگی کا خوب مظاہرہ کیا۔ اب کارخانے بند پڑے ہیں۔ سرمایہ دار وہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ جو سرمایہ لگانے کی سوچ رہے تھے وہ باز آ گئے ہیں۔ اس سے کس کا گھر پھنکا؟ کس کے گھر گھی کے چراغ جلے؟ کون سیلاب ہلاکت میں غرق ہو رہا ہے؟ صوبائی حکومت دیکھ رہی ہے، مرکز دیکھ رہا ہے اور پاکستان جل رہا ہے۔ ہر کوئی یہی سوچ رہا ہے کہ میں اس آگ سے بچ جاؤں لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ پاکستان تباہ ہوا تو ان میں سے ایک بھی باقی نہیں بچے گا۔

سندھ میں جنگِ زرگری

یہ بنگال میں ہو رہا ہے۔ اب ذرا باب الاسلام سندھ کی طرف آئیے۔ گذشتہ سال یہاں انتخابات ہوئے اس سے پیشتر صوبے میں دفعہ ۹۲-الف کا نفاذ تھا کیونکہ سابقہ وزارت اہلیت نظم و نسق کھو چکی تھی۔ انتخابات کے متعلق ایک شہرہ تھا کہ آزاد اور منصفانہ ہوئے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی گئی کہ جمہوریت کا شجر طیبہ برگ و بار لا رہا ہے۔ لیکن جب نتیجہ سامنے آیا تو ایک عالم دنگ رہ گیا۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اپنا لیڈر منتخب کیا۔ میر صاحب کے خلاف پروڈا کی درخواست کی سماعت ہو رہی تھی اسلئے انھوں نے وزیر اعلیٰ بننا پسند نہ کیا گو اسمبلی کے سپیکر بن گئے۔ انھوں نے اپنی طرف سے پیرزادہ عبدالستار کو نامزد کیا۔ حالانکہ پارٹی کو خود دوسرا لیڈر منتخب کرنا چاہیے تھا۔ پیرزادہ صاحب مرکز سے برطرف ہو چکے تھے اور صوبائی اسمبلی کے رکن تک نہ تھے۔ ان کی وزارت بنی۔ سب نے ان کی بیعت کی۔ لیکن تھوڑے عرصہ میں وہ پارٹی کا "اعتماد" کھو بیٹھے۔ ہوا کیا؟ پارٹی کے منشور یا پروگرام سے انحراف کیا؟ نہیں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ پروگرام سرے سے تھا ہی نہیں۔ پھر؟ بس یہی کہ چند لوگ ان کی بجائے اپنی وزارت بنانا چاہتے تھے۔ اس وزارت کے تین وزیر "باغی" ہو گئے۔ وزارت باقی ہے لیکن وزیر کہہ رہے ہیں کہ انھیں وزارت پر اعتماد نہیں۔ طرفین اس ادھیڑ بن میں ہیں کہ ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملائیں۔ ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اکثریت اس کے ساتھ ہے اور کیوں نہ ہو، ارکان اسمبلی ہر ایک سے عہد وفا باندھ رہے ہیں۔ نہ کوئی ضبط ہے نہ نظم، نہ پارٹی کا خیال، نہ صوبے کا لحاظ، نہ ملک کا احترام۔ معاملہ وزیر اعظم تک پہنچا ہے۔ وہ متعلقہ حضرات سے بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ مشورے مسٹر کھوڑو تک سے ہوتے ہیں جو پروڈا کے سزا یافتہ ہیں۔ وہ نہ اسمبلی کے رکن ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ وہ جس مسلم لیگ میں ہیں اسے مسلم لیگ کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ مگر معاملہ چل رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ مطالبہ کرتے ہیں کہ "باغیوں" کو برطرف کر دیا جائے۔ "باغی" مطالبہ کرتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ کو ہٹا دیا جائے۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی ہے کہ تین وزراء کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ جب تک یہ وزراء حکومت میں تھے اور جب تک انھیں توقع تھی کہ وہ حکومت میں رہیں گے، وہ اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلاتے رہے اور وزیر اعلیٰ پر الزام لگاتے رہے کہ وہ مسلم لیگ کو خراب کر رہے ہیں، لیکن جب ان کو وزارت سے نکال دیا گیا تو انھوں نے مسلم لیگ سے استعفا دیدیا اور "متحدہ محاذ" بنانے کی فکر کرنے لگے۔ اگر سندھ میں "متحدہ محاذ" قائم ہوا تو اس کی کیفیت وہی ہوگی جو بنگال میں ہے کیونکہ ان کے سامنے نہ اعلیٰ مقاصد ہیں نہ ملی شعور ہے جو ان کو یکجا کر سکے اور رکھ سکے۔ جب حکومت کا یہ حال ہو تو صوبے کا اللہ مالک ہے۔ اس پر بھی ابھی تعجب کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں قیمتیں کیوں چڑھتی جا رہی ہیں، معیار زیست کیوں پست ہوتا جا رہا ہے اور مصائب و مشکلات کا کیوں ہجوم ہے!

پنجاب!

پنجاب کی "خانہ جنگی" مرکز کے سٹیج پر لڑی جا رہی ہے۔ مرکز کے دو پنجابی وزیروں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہے اور انھیں برطرف کرنے کیلئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک چودھری ظفر اللہ ہیں اور دوسرے مسٹر گورمانی۔ ۱۹۵۳ء میں جب پنجاب میں چودھری صاحب کے خلاف ایک طوفان اٹھا تھا تو اسی گروہ نے لوگوں کے خلاف گولیاں چلائی تھیں جو آج چودھری صاحب کی برطرفی پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ان کو برطرف کرا کے خود خالی کرسی پر متمکن ہونا چاہتے ہیں اور صوبے پر یہ احسان دھرینگے کہ ہم نے تمہارا مطالبہ منظور کرا دیا۔ ——— مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!! اب ایک اور ہنگامہ پرورش پا رہا ہے۔ مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب کے جن وزراء اور ارکان اسمبلی نے اردو اور بنگالی کے حق میں ووٹ نہیں دیا ان کے خلاف قرار داد مذمت کا چرچا ہو رہا ہے اور یہی طبقہ پیش پیش کر

بجائے اس کے کہ وہ اپنی غداری کا احساس کرے وہ اس کی قیمت طلب کر رہا ہے اور قیمت حکومت سے کم نہیں مانگ رہا۔ ان میں سے کسی ایک سے کہئے کہ ذرا اپنے اپنے حلقہ میں جا کر رائے دہندوں سے کہے کہ میں نے بنگالی کے حق میں ووٹ دیا ہے پھر دیکھیے کہ اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ لیکن مرکز میں بیٹھ کر وہ اینٹھ رہے ہیں اور اپنی حب الوطنی کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں۔ یہی لوگ بنگالیوں سے خفیہ معاہدے کر رہے ہیں کہ تم ہماری تائید کرو ہم تمہارے مطالبات کی تائید کریں گے —— یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور قوم دیکھ رہی ہے۔

اے محمدؐ گر قیامت را بر آری سر ز خاک سر بر آر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کی اس "خانہ جنگی" سے اغیار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہندوستان پوری طرح کشمیر کو ہڑپ کر چکا ہے اور یہاں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ کسی نے اس کا نوٹس لیا تو بس اس قدر کہ ایک بیان دے کر ہندوستان کو برا بھلا کہہ دیا اور بس۔ کشمیر کا معاملہ یوں تو برسوں سے ملتوی ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن گذشتہ سال اس میں ایک اور موڑ آیا۔ محمد علی صاحب نے وزیر اعظم بنتے ہی ہندوستان سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کیں تو پنڈت نہرو نے موقع کو غنیمت جان کر اقوامِ متحدہ سے کشمیر کو نکالنے کی ایک چال چلی۔ انھوں نے براہِ راست مذاکرات کا چکمہ دیا اور وہ داؤ چل گیا۔ وہ کراچی بھی آئے اور برای العین دیکھ لیا کہ پاکستان کے قائدین کدھر جا رہے ہیں۔ انھوں نے یہاں سے جاتے ہی عبداللہ کو برطرف کر دیا۔ انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس پر کچھ نہیں ہوگا۔ عبداللہ کی برطرفی کے ساتھ ہی انھوں نے مذاکرات شروع کر دیئے اور جب ہنگامہ ذرا فرو ہو گیا تو محمد علی صاحب کو ایک طرف کر دیا۔ اپریل کے آخر تک ناظمِ استصواب کو مقرر ہونا چاہئے تھا مگر اس مدت میں پنڈت جی نے وزیر اعظم پاکستان سے ملاقات تک نہ کی۔ اب ہندوستان کے صدر نے کشمیر کے الحاق کا اعلان کر دیا ہے اور پنڈت نہرو نے پارلیمان میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں جو بین الاقوامی معاہدات تھے وہ خاص پس منظر میں تھے اور اسی پس منظر میں پورے کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ امریکی امداد سے کشمیر کے تصفیہ کا پس منظر بدل گیا ہے۔ گویا اب انھوں نے علانیہ کہہ دیا کشمیر کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کے باشندوں کو استصواب کے ذریعہ اپنے مستقبل کا تصفیہ کرنے کا حق ہوگا وہ ناقابلِ عمل ہے۔ اب جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے کشمیر کا معاملہ ختم ہے۔ پاکستان کے پاس جنگ کے علاوہ ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ پھر سے معاملہ کو اقوامِ متحدہ میں پیش کیا جائے۔ لیکن کیا اس افراتفری میں اب یہ کیا جا سکے گا اور کیا گیا تو اقوامِ متحدہ سے کچھ منوایا جا سکے گا؟ ان سوالات کا جواب بہت جلد مل جائے گا۔

یہ ہیں وہ دلخراش اور جگر سوز حالات جن سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں۔ عوام بیچارے معاشی بدحالیوں میں مبتلا ہیں۔ انھیں پیٹ کے دھندے سے فرصت نہیں۔ اشیائے ضروریات دن بدن گراں سے گراں تر ہوتی جا رہی ہیں۔ کاروبار میں کمی آتی جا رہی ہے جس سے ان کے مصائب میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اوپر کا طبقہ اپنے اپنے مفاد کے حصول اور تحفظ میں دیوانہ وار نگوڑے کا سا رقص کر رہا ہے۔ اسے اس کے سوا کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں۔ اور پاکستان تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔

اس وقت ضرورت ہے ایک جرأت مندانہ اقدام کی جو پوری ملت اور ملک کی حفاظت کے شدید جذبہ سے ابھرے اور اس خطۂ زمین کو گرنے سے بچائے جو ہمارے جان، مال، عزت، آبرو کا محافظ ہے اور جس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

———— • ————

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراج انسانیت ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں تقریباً دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین۔ گردپوش مرصع و دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش و رنگین۔ قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ ضخامت ۴۰۰ قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے اسمیں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں ضخامت ۴۸ ۹ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستورِ پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد بنیادی اصول و حقوق حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

اسباب زوال امت (پرویز) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد طلائی گردپوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات ملّا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق مثلاً (۱) تبدیل مذہب کرنیوالوں کو قتل کر دیا جائیگا (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جاسکیں گی (۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جائیگا۔ قرآن کی روشنی میں ملّا کے خود ساختہ مذہب کا ابطال اور تینوں مسائل کا حل اگر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

سلیم کے نام خطوط محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہو گئے ہیں ان کا نہایت شگفتہ، شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنھیں ضخیم ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۵ صفحات مجلد مع حسین گردپوش قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے دورِ حاضر کی ایک اہم کوشش جسمیں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل و معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دیگی ضخامت ۴۰۸ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے۔

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ایسے ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر بیک وقت آپکے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز اور تنقید کے لیے گہرے نشتر، اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دورِ آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارہ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ (صدر) کراچی